قرآن کریم اور سُنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

# بینات

جلد: ۹۰ شمارہ: ۲

صفر المظفر: ۱۴۴۸ھ - اگست: ۲۰۲۶ء

قیمت فی شمارہ: ۷۰ روپے، زرِسالانہ: ۸۰۰ روپے

زرِسالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: ۱۲۰۰ روپے

مُدیر/مُدیر مسئول

**مولانا سید سلیمان یوسف بنوری**

نائب مُدیر

**مولانا سید احمد یوسف بنوری**

مُدیر معاوِن

**مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ**

**خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ**

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800 پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

**بیرونِ ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک**

یورپی اور امریکی ممالک، وغیرہ: 60 امریکی ڈالر

عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 60 امریکی ڈالر

**اکاؤنٹ نمبر**

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

**وضاحت**

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

**جامعۃ العلوم الاسلامیۃ**

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: 34919531-21-92 +

***Web***: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری مطبع: شفق پرنٹنگ پریس طابع: حافظ ثناء اللہ واحدی

# فہرستِ مضامین

## بصائر وعبر


| | | |
|---|---|---|
| کرپٹوکرنسی اور اہلِ فتویٰ! | ۳ | محمد اعجاز مصطفیٰ |


## مقالات ومضامین


| | | |
|---|---|---|
| مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت مولانا محمد انور تابی مدظلہم | ۸ | مولانا سید سلیمان یوسف بنوری |
| حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری قُدس سرُّہٗ | ۱۳ | مفتی عبدالروف غزنوی |
| گرمی اور موسم گرما | ۲۲ | مولانا ابوخالد قاسمی |
| استاذ اور تربیت نسل ... چند اہم اصول اور رہنما نکات | ۲۸ | مولانا عبدالمتین |
| خدمت خلق ... اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی پہچان | ۳۰ | مولانا محمد راشد شفیع |
| حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن وجمال | ۳۵ | مولانا قاری محمد سلمان عثمانی |
| دین خیرخواہی کا نام ہے | ۳۸ | مفتی ابوالخیر عارف محمود |
| قرن اول سے قیاس کی چند مثالیں | ۴۰ | مولانا عصمت اللہ نظامانی |
| حق مہر کی شرعی حقیقت اور رائج تصورات کا جائزہ | ۴۷ | مولانا سید انور شاہ |


## یادِ رفتگاں


| | | |
|---|---|---|
| حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری رحمۃ اللہ علیہ | ۵۷ | محمد اعجاز مصطفیٰ |
| حضرت مولانا محمد طیب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ | ۵۹ | |


## دار الافتاء


| | | |
|---|---|---|
| اپنا مکان خود پر، بیوی پر، پھر فقراء پر وقف کرنا | ۶۲ | ادارہ |


## نقد ونظر


| | | |
|---|---|---|
| الحصن الأعظم اردو شرح الحزب الأعظم | ۶۴ | ادارہ |

بصائر و عبر

# کرپٹوکرنسی اور اہلِ فتویٰ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی!

دورِ حاضر میں جہاں اور بہت سے فتنے اور گمراہیاں مسلمانوں میں دَر آئی ہیں، وہیں اِعجابِ رائے (خود پسندی) اور غیر اہلِ علم کا دینی معاملات میں دخل دینا اور عوام الناس کو علمائے کرام سے متنفر کرنا بھی اس دور کا فتنہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

’’... حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا، وَهَوًى مُتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَ إِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ .‘‘

(سنن الترمذي ، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، حديث : ۳۰۵۸)

ترجمہ: ’’... یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ لوگ بخل کے راستے پر چل پڑے ہیں، خواہشاتِ نفس کے پیرو ہو گئے ہیں، دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر عقل ورائے والا بس اپنی ہی عقل ورائے پر مست اور مگن ہے۔‘‘

حال ہی میں اس کا تازہ مشاہدہ ہوا کہ کرپٹوکرنسی سے متعلق اہلِ علم خصوصاً حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم (صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان) کی رائے سامنے آئی، جو کہ صرف ان کی ہی

رائے نہیں ہے، بلکہ علمائے کرام کی متفقہ رائے ہے کہ کرپٹو کرنسی کے ذریعے لین دین کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ تاحال اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی اصل کے اعتبار سے یہ مال ہونے کی حیثیت سے وجود رکھتی ہے۔ لیکن اس فتوے کے خلاف میڈیا پر ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کر دیا گیا، علمائے کرام کو زمانے سے نابلد کہا جانے لگا، اور یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ علماء کرام پہلے ہر چیز کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعد میں حلال کہہ دیتے ہیں۔

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی نیا معاملہ سامنے آئے تو مسلمان اسے قرآن وسنت کی رُو سے پرکھنے کے پابند ہیں۔ کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ خواہشِ نفس یا عوامی شور شرابے پر نہیں، بلکہ ان قطعی نصوص اور اَبدی اُصولوں کی روشنی میں دیا جاتا ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں طے کیے جا چکے ہیں۔ کیا چیز مال ہے اور کیا چیز مال نہیں ہے؟ دین کے ان اصولوں نے طے کر دیا ہے، مثلاً: خنزیر اور مردار مال نہیں ہیں، گو غیر مسلم انھیں مال کی حیثیت دے کر تبادلہ کرتے رہیں، اور شراب اگرچہ غیر مسلموں کے لیے تو مال ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ مال نہیں ہے۔ دین کے اصولوں ہی سے اخذ کیا جاتا ہے کہ کس چیز کے تبادلے میں کون سی چیز قابلِ فروخت ہے اور کون سی چیز قابلِ فروخت نہیں، نیز کس چیز کو اس کی قانونی قیمت سمجھا جائے گا اور کس کو نہیں؟ مال کا مال کے ساتھ تبادلے کا عقد کیے جانے کے بعد اگر فروخت کنندہ خریدار کو مال نہ دے، یا خریدار فروخت کنندہ کو قیمت ادا نہ کرے، یا خریدار مال خرید لینے کے بعد فروخت کنندہ کے پاس رکھوائے اور وہ ضائع ہوجائے، تو کون ذمہ دار ہوگا اور کس کا مال ضائع ہوگا؟ یہ سب کچھ شریعت نے واضح کر دیا ہے۔ اسی طرح خریدا ہوا مال ضائع ہونے کے بعد اسی جیسا دینا ہوگا یا اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی؟ پھر مال کی وہ مخصوص صورت' جسے آج کل کرنسی کہا جاتا ہے، اس کی حیثیت کا تعین بھی دین کے اصولوں کی رُو سے ہوگا کہ کس چیز کو کرنسی مان سکتے ہیں اور کس کو نہیں؟

کرپٹو کرنسی کا آغاز دنیا میں ۲۰۰۹ء میں ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں پاکستان میں ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد نے اس کا استعمال شروع کیا، لیکن اس وقت نہ کوئی سرکاری قانون موجود تھا اور نہ ہی علماء کی جانب سے اس پر تفصیلی فتاویٰ سامنے آئے تھے۔ ۲۰۱۷ء میں مصر کے مفتی اعظم نے اس کو ناجائز قرار دیا، پاکستان میں ۲۰۱۷ء کے دوران کرپٹو کرنسی پر باقاعدہ فقہی تحقیق شروع ہوئی۔ اسی سال ہماری جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے ماہنامہ بینات کے رجب ۱۴۳۸ھ (۲۰۱۷ء) کے شمارے میں ''ڈیجیٹل کرنسی اور ون کوائن (OneCoin) کمپنی کا کاروبار'' کے عنوان سے ایک تفصیلی تحقیقی مضمون شائع ہوا۔ اس میں ڈیجیٹل کرنسیوں کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ اس وقت ان کی شرعی حیثیت

واضح نہیں، ان میں غرر (غیر یقینی)، قیمتوں کا اُتار چڑھاؤ، حکومتی ضمانت کا فقدان اور دیگر شرعی و معاشی خدشات موجود ہیں، اس لیے ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ۶/اپریل ۲۰۱۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے تمام بینکوں، مالیاتی اداروں اور ادائیگی کا نظام فراہم کرنے والوں کو ہدایت جاری کی کہ وہ ورچوئل کرنسیوں اور ٹوکنز سے متعلق لین دین یا سہولت فراہم نہ کریں؛ کیوں کہ یہ پاکستان میں قانونی کرنسی نہیں ہیں اور اسٹیٹ بینک نے انہیں لائسنس یا منظوری نہیں دی۔ ۱۸/اپریل ۲۰۱۸ء کو ایکسچینج کمپنیوں کے لیے بھی اسی نوعیت کی ہدایات جاری کی گئیں۔ ۶/نومبر ۲۰۱۸ء کو جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء کی ویب سائٹ پر بٹ کوائن کے بارے میں ایک مختصر فتویٰ شائع ہوا، جس میں کہا گیا کہ بٹ کوائن کی شرعی حیثیت واضح نہیں، اس لیے اس کی خرید وفروخت اور اس کے ذریعے کاروبار سے گریز کیا جائے۔ ۲۰۲۲ء تک جامعہ بنوری ٹاؤن سے جاری ہونے والے متعدد جوابات میں بنیادی طور پر یہی موقف برقرار رہا کہ موجودہ صورت میں کرپٹو کرنسی کی خرید وفروخت سے اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے متعلق شرعی اور معاشی خدشات برقرار ہیں۔ جب کہ ۲۰۲۲ء سے کرپٹو کرنسی کی مائننگ، خرید وفروخت اور اس کے ذریعے کاروبار کے عدمِ جواز کا فتویٰ جاری ہو رہا ہے؛ کیوں کہ اس میں حقیقی کرنسی کے بنیادی اوصاف اور شرائط موجود نہیں ہیں۔ جون ۲۰۲۶ء میں جامعہ دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء نے ایک فتویٰ جاری کیا، جس پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم سمیت متعدد جید مفتیانِ کرام کے دستخط تھے، اس میں موجودہ صورتِ حال کے مطابق کرپٹو کرنسی کو شرعی اعتبار سے مال نہ مانتے ہوئے اس کے ذریعے خرید وفروخت کو ناجائز قرار دیا گیا۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ کرپٹو کرنسی شریعت کے اصولوں کے تحت مال (ویلتھ) نہیں، بلکہ محض کھاتوں میں فرضی نمبروں کا اندراج ہے۔

اسی نوعیت کے فتاویٰ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن اور دارالعلوم دیوبند سے بھی جاری ہوئے ہیں، بطورِ مثال ملاحظہ ہوں:

❶۔ ’’کرپٹو کرنسی میں پیسے لگانا ناجائز ہے۔ تجارت کے مسائل کا انسائیکلو پیڈیا میں ہے: ’’بٹ کوائن‘‘ محض ایک فرضی کرنسی ہے، اس میں حقیقی کرنسی کے بنیادی اوصاف اور شرائط بالکل موجود نہیں ہیں، لہٰذا موجودہ زمانے میں کوئن یا ڈیجیٹل کرنسی کی خرید وفروخت کے نام سے انٹرنیٹ پر اور الیکٹرونک مارکیٹ میں جو کاروبار چل رہا ہے وہ حلال اور جائز نہیں ہے، وہ محض دھوکا ہے، اس میں حقیقت میں کوئی مادی چیز نہیں ہوتی، اور اس میں قبضہ بھی نہیں ہوتا، صرف اکاؤنٹ میں کچھ عدد آ جاتے ہیں، اور یہ فاریکس ٹریڈنگ کی طرح سود اور جوے کی ایک شکل ہے، اس لیے بٹ کوائن یا کسی بھی ڈیجیٹل کرنسی کے نام نہاد کاروبار میں پیسے لگانا

اور خرید وفروخت میں شامل ہونا جائز نہیں ہے۔(۲/ ۹۲) فقط، واللہ اعلم! (فتویٰ نمبر: 144210200100، دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)‘‘

❷۔ ’’واضح رہے کہ شریعت میں کرنسی کے جو اوصاف اور شرائط بیان کی گئی ہیں، کرپٹو کرنسی میں وہ اوصاف وشرائط نہیں پائی جاتیں، شرعاً کرنسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خارج میں وجود رکھتا ہو، یعنی وہ عین ہو اور اس کو اسٹاک بھی کیا جاسکتا ہو، جب کہ کرپٹو کرنسی کا نہ تو حقیقت میں کوئی وجود ہے، اور نہ ہی اس کو اسٹاک کیا جانا ممکن ہے، اس کے مالک کے پاس اکاؤنٹ میں سوائے ہندسوں کے کچھ نہیں ہوتا؛ لہٰذا شریعت کی رو سے یہ کرنسی نہیں ہے، اس کے ذریعہ لین دین اور کاروبار کرنا جائز نہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ پر درج ذیل فتویٰ موجود ہے:

کرپٹو کرنسی (بٹ کوائن وغیرہ) ایک فرضی کرنسی ہے اور اس کا عنوان ہاتھی کے دانت کی طرح محض دکھانے کی چیز ہے اور فقہائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں یہ کرنسی از روئے شرع مال نہیں ہے اور نہ ہی ثمنِ عرفی۔ نیز اس کاروبار میں حقیقت میں کوئی مبیع وغیرہ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں بیع کے جواز کی شرعی شرطیں پائی جاتی ہیں؛ بلکہ درحقیقت یہ فاریکس ٹریڈنگ کی طرح سود اور جوے کی شکل ہے؛ اس لیے کرپٹو کرنسی (بٹ کوائن یا کسی بھی ڈیجیٹل کرنسی) کی خرید وفروخت کی شکل میں نیٹ پر چلنے والا کاروبار شرعاً حلال وجائز نہیں ہے، مسلمانوں کو اس میں حصہ داری نہیں کرنی چاہیے۔‘‘ (فتویٰ نمبر: 692-617:1439) فقط، واللہ اعلم!‘‘

(فتویٰ نمبر: 144509101103، دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)

قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی جانب سے دیے گئے بیان کے بعد حکومتی ادارہ پی وی اے آر اے کے چیئرمین جناب بلال بن ثاقب صاحب نے مفتی تقی عثمانی صاحب سے رابطہ کیا ہے، جس میں ان سے ڈیجیٹل اثاثہ جات کی شرعی حیثیت پر بات چیت ہوئی۔ جناب بلال بن ثاقب صاحب نے سماجی رابطے کے پلیٹ فارم ایکس پر اپنے ایک پیغام میں بتایا کہ ڈیجیٹل اثاثوں اور ان کی شرعی حیثیت کے حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب سے ایک تعمیری بات چیت ہوئی، جس میں مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ہمارے درمیان پاکستانی شہریوں کو مالی فراڈ، استحصال اور ممکنہ مالی نقصانات سے محفوظ رکھنے پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ بلاک چین، ڈیجیٹل اثاثہ جات، سٹیبل کوائنز اور حقیقی دنیا کے اثاثوں کی ٹوکنائزیشن مختلف نوعیت کی ٹیکنالوجیز اور استعمالات پر مشتمل شعبے ہیں، اس لیے ان کا تکنیکی اور شرعی دونوں پہلوؤں سے احتیاط اور جامع انداز میں جائزہ لیا جانا چاہیے۔ بیان کے مطابق چوں کہ یہ شعبہ تیزی سے

ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے، اس لیے اُمید ہے کہ مستقبل میں علماء، ریگولیٹرز اور صنعت سے وابستہ ماہرین کے درمیان مکالمہ جاری رہے گا، تاکہ پاکستان کی پالیسی اسلامی اصولوں اور جدید ٹیکنالوجی دونوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تشکیل دی جاسکے۔

ہم عوام الناس سے بھی گزارش کریں گے کہ شرعی مسائل خصوصاً پیش آمدہ مسائل کے بارے میں قرآن وسنت کے حکم کے مطابق علمائے کرام ہی کی طرف رجوع کریں اور اپنی رائے کے اظہار اور پھر اس پر اصرار سے گریز کریں، جیسا کہ ڈیجیٹل کرنسی کے حکومتی ادارہ کے ذمہ دار نے اہلِ علم سے صحت مندانہ مکالمہ کیا اور انہوں نے اس ایشو کو علماء کرام کی تضحیک کا ذریعہ بنانے اور انہیں دقیانوس قرار دینے کی بجائے ان سے استفادہ کرنا بہتر سمجھا۔ اسی طرح سوشل میڈیا کی لت میں مبتلا افراد بھی دینی امور پر رائے زنی کی بجائے اہلِ افتا کے فتاویٰ کو سامنے رکھ کر اپنی معیشت کی نوک پلک سنواریں تو ان شاء اللہ! ان کے کاروبار میں بھی برکت ہوگی اور ملکی معاشی ترقی کے لیے بھی وہ مثبت کردار ادا کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو علمائے کرام کی قدر شناسی نصیب فرمائے، اعجابِ رائے کے فتنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ ہمارے حکمرانوں کو وطن عزیز پاکستان کی معیشت کو اسلامی اصولوں پر چلانے کا خوگر بنائے اور ہمارے عوام کو اس کے لیے صحت مند کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبي الکریم!

وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیّدنا محمّد وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ أجمعین

# مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

## بنام حضرت مولانا محمد انور تائبی مدظلہم

انتخاب وترجمہ: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

### حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت مولانا محمد انور تائبی مدظلہم (۱)

باسمہٖ تعالیٰ

برادرِ گرامی قدر محترم مولانا محمد انور صاحب زادکم اللہ قدرًا !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

نامۂ کرم ٹیلی فون کے بعد پہنچا، صرف آپ کی خوش نودی کے لیے حاضری کا ارادہ ہوگیا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا، نہ تقریر کی اہلیت نہ سفر کے لیے فرصت، نہ کسی اور مصروفیت کے لیے موزونیت۔ خدا کرے آپ کے مزاجِ گرامی اور حضرت والد محترم (۲) بخیریت ہوں، موصوف کی خدمت میں سلام و درخواستِ دعا ہے۔

والسلام

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۹؍ربیع الآخر ۱۳۸۶ھ

---

برادرِ گرامی مفاخر مولانا محمد انور صاحب

وفّقکم اللہ لکلّ خیر، وجعلکم خیرَ خلفٍ لخیر سلفٍ، آمین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! تحیّۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ!

حضرت مولانا شیر محمد صاحب آپ کے والدِ محترم کی وفات سے بہت صدمہ ہوا تھا، وقت پر نامۂ تعزیت نہ لکھ سکا، بعد میں تعزیت خلافِ سنت معلوم ہوئی، اس لیے شرعی یا رسمی تعزیت سے مُقصّر رہا، لیکن الحمدللہ قلبی ولسانی دعوات وذکرِ خیر میں تقصیر نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور رحمت ورضوان سے سرفراز فرمائے، بینات میں چند حرف لکھنے کا ارادہ تھا، وہ بھی نہ ہوسکا۔ الحمدللہ کہ ان کی شخصیت وحیثیت ان اخباری تذکروں سے بالاتر ہے، تاہم تاریخ اور دن اور وقت سے دوبارہ مطلع فرمائیں، اور مشائخ اور مشائخِ طریقت کا ذکر فرمائیں، اگر موقع ملا تو چند سطریں تحریر کروں گا۔ رہی ان کی وصیت تو یہ ان کا حسنِ ظن ہے، اور اہل اللہ کا حسنِ ظن بھی ہمارے (لیے) باعثِ نجات ہے، جو نصح وخیر خواہی ممکن ہوگی، اس میں تقصیر نہ ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ!

خدا کرے کہ آپ اور برادرانم عبدالغفور صاحب (۳) اور مولوی غلام محمد صاحب (۴) سب بخیر ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو والدِ محترم کا صحیح اور بہترین جانشین بنائے، اور امت کو آپ سے نفع پہنچائے، آمین! دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب کو سلامِ مسنون!

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۱۲؍شوال ۱۳۸۶ھ

---

أخي في الله شيخ محمد أنور، نوّر الله قلبه، وزاده نورًا !

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته!

آپ کا والا نامہ باعثِ شرف ہوا، آپ کے فضل وکمال کے لیے شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ اسے پڑھا؛ کیونکہ طویل مدت سے میں خود کو محروم پاتا ہوں، کسی خیر کی توفیق نہیں مل رہی، اور میری زندگی ان دنوں ایسی ہے کہ گویا اس میں کوئی خیر وبھلائی نہیں۔ آپ کی جانب سے خوش خبری اور خواب میری پیاس کی سیرابی اور یاس وقنوطیت کے اندھیروں میں روشنی کا سامان بنا۔ بخوبی واقف ہوں جیسا کہ سیدنا (امام) مالکؒ کا قول ہے: ''الرُّؤيَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ'' یعنی ''اچھا خواب، باعثِ مسرت وبشارت تو ہوتا ہے، دھوکے میں نہیں ڈالتا۔'' لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل زیادہ وسیع ہے اور اس کے کرم سے زیادہ امیدیں ہیں، وہ اپنے بندوں پر جیسے چاہے فضل فرمائے۔ بہرکیف یہ خواب دیکھنے والے کے لیے بھی باعثِ بشارت ہے اور جس کے لیے دیکھا گیا اس کے لیے بھی۔ اس خواب سے آگاہی پر آپ کا شکر گزار ہوں، اور ہمیں امید ہے کہ مبارک ثابت ہوگا۔

آپ اپنے جائے سکونت کو واپس لوٹ گئے اور مجھے اطلاع ہی نہ ہوئی، خیال تھا کہ الوداع کہوں گا، کئی روز بعد علم ہوا کہ کان میں درد اور تکلیف کی بنا پر آپ لوٹ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا و عافیتِ کاملہ عطا فرمائے۔

برادرِ کریم سے امید ہے کہ مجھے نیک دعاؤں سے فراموش نہ فرمائیں گے کہ میرے دبیز حجابات زائل ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ میری زندگی معاصی اور خطاؤں سے پاک فرمادیں، اور آپ کا اجر اسی اللہ سے مل سکتا ہے جو نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۲۹/ربیع الاول ۱۳۸۹ھ

**نوٹ:** یہ مکتوب، عربی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

---

برادرِ گرامی مفاخر مولانا محمد انور وفّقه الله لكلّ خير وسعادة!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نامہ گرامی مشتمل بر بشارات موصول ہوا، أحسن الله إليكم وجزاكم خيرا۔ حضرتِ والد صاحب (مولانا سید محمد زکریا بنوری رحمۃ اللہ علیہ) کو سنایا، بہت خوش ہوئے، اور اس کو کتاب ''المبشّرات'' میں درج کیا۔ نیز آپ کے ہدیہ ایصالِ ثواب درود شریف اور کلمہ طیبہ سے بہت محظوظ ہوئے، سلام ودعا فرماتے ہیں۔

والسلام

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۲۶/محرم الحرام ۱۳۹۱ھ

---

۶/ربیع الاول ۱۳۹۱ھ

برادرِ گرامی، أخي في الله، ورفيقي في سبيل الله، نوّر الله قلبك، وزادك نورًا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں سخت آزمائش اور حد درجہ قلبی وذہنی تکلیف میں مبتلا تھا، شاید میری زندگی میں اس سے زیادہ

غم واندوہ کے دن نہیں گزرے، حتیٰ کہ بلاء شدید کے اس گھیراؤ میں درسِ بخاری میں بھی حاضر نہیں ہوسکتا تھا۔ برادرِ گرامی! انہی لمحات میں آپ کے والا نامہ کی صورت میں ہاتفِ غیبی آیا، جو میرے رنجیدہ دل کے لیے ڈھارس اور غم واندوہ میں تخفیف کا باعث بنا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے حقیقی معنوں میں ربّانی بشارت بنائے، اور مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالے جس کا مجھ میں تحمل نہیں، بلاشبہ وہ نہایت شفیق، مہربان، سمیع اور قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے برادرِ عزیز کے لیے اس کی مرضیات کی توفیق کا سوالی ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم علیه صلواته وسلامه کے طفیل ان کی آخرت کو دنیا سے بہتر بنائے، ہم سب کو سعادت مند بنائے، ہمیں بدبختوں میں سے نہ بنائے، ہماری شامتِ اعمال کی بنا پر ہمیں رسوا نہ فرمائے، ہمیشہ اپنی ستاری کی حسین چادر ہم پر تانے رکھے، وہی ہمارے لیے کافی اور بہترین کارساز ہے۔

والسلام علیه ورحمة الله وبرکاته!

آپ کا مخلص محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

**نوٹ:** یہ مکتوب، عربی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

---

## حواشی

۱۔حضرت مولانا محمد انور تائبی مدظلہم حضرت والد صاحبؒ کے چچا سسر اور جامعہ انوار العلوم (سکھر) کے رئیس وشیخ الحدیث ہیں۔ غالباً سنہ ۱۳۳۵ھ میں حضرت مولانا شیر محمد تائبی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اپنے والد حضرت مولانا شیر محمد تائبیؒ کی آغوشِ تربیت میں تعلیم وتربیت پائی، بعد ازاں سعودی عرب کے کبار علماء سے استفادہ کیا، شیخ محمود طرازیؒ سے انہیں اجازتِ حدیث حاصل ہے۔ کچھ عرصے سے علیل ہیں، قارئین سے ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

۲۔حضرت مولانا شیر محمد صاحب تائبی رحمۃ اللہ علیہ، مکتوب الیہ مولانا محمد انور صاحب مدظلہم کے والد اور راقم کے پرنانا تھے۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحب تائبیؒ کے تین بیٹے تھے: بڑے بیٹے مولانا گل محمدؒ، مجھلے بیٹے مولانا محمد انور صاحب اور چھوٹے بیٹے مولانا غلام محمدؒ۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شیر محمد تائبیؒ کی وفات کے موقع پر تاثراتی تحریر میں لکھا تھا: ''مغربی پاکستان کے علاقہ سندھ کے ایک مشہور اور معمر عالمِ دین مولانا شیر محمد صاحبؒ نے ۲۵ر رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ کی شب میں داعیِ اجل کو لبیک کہی۔ موصوف، سندھ کے محقق عالم، متواضع درویش اور منکسر المزاج بزرگ تھے، باخدا شخصیت تھی، صرف ونحو کے امام تھے، مسائلِ صرف اور دقائقِ نحو سے شغف کیا عشق تھا، علمِ صرف میں ایک عمدہ کتاب کے مصنف تھے، اور سکھر میں دینی درس گاہ (جامعہ انوار العلوم، سکھر) کے مؤسس تھے۔ موت بھی عجیب ہوئی، ۲۴ر رمضان کی صبح کو غسل کی، نئے کپڑے زیبِ تن کیے، گویا سفر کی تیاری ہے، دن بھر روزہ رہا، قبل افطار زیادہ طبیعت خراب ہوگئی، معمولی علالت کا سلسلہ پہلے ہی سے چلا آرہا تھا، کچھ وصیتیں

فرمائیں، افطار کے وقت غنودگی بڑھ گئی، جس کی وجہ سے افطار نہ ہوسکا، بالآخر نصف شب ۲۵ رمضان کو روح، قفسِ عنصری سے ''اللہ اللہ'' کہہ کر پرواز کرگئی: إنا للہ وإنا إلیہ راجعون! سبحان اللہ! موت کیا تھی؟! گویا زندگی کا رخ دنیا سے عالمِ آخرت کی طرف مڑ گیا، اور طرفۃ العین میں عالمِ فانی سے کٹ کر عالمِ آخرت سے جڑ گئے، راقم الحروف کے کرم فرما اور دعاگو تھے۔'' (یادِ رفتگاں، ص: ۴۴ و ۴۵، مکتبہ بینات) اسی تأثراتی تحریر کے آخر میں حضرت کے صاحب زادے اور مکتوب الیہ مولانا محمد انور صاحب مدظلہم کے متعلق حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''خدا کا شکر ہے کہ ان کے خلفِ رشید برادرم مولانا محمد انور صاحب موجود ہیں، ان سے توقع ہے کہ وہ مرحوم باپ کی جانشینی کا حق ادا کرسکیں گے۔'' (ایضاً، ص: ۴۵) حضرت مولانا شیر محمد تائبی رحمۃ اللہ علیہ ہی ہمارے ننھیال کی وہ پہلی شخصیت ہیں جن سے حضرت والد ماجدؒ کی سب سے پہلے ملاقات ہوئی اور وہی ملاقات ہمارے ننھیال سے والد ماجدؒ کے تعلق کا ذریعہ بنی۔

۳- حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدظلہم، جامعہ کے قدیم فاضل، حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردِ رشید، مدرسہ صولتیہ و جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کے سابق استاذ۔ ۱۶؍ ذوالقعدہ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے جامعہ خیر المدارس سے استفادہ کیا اور اس کے بعد ۱۳۸۱ھ میں جامعہ سے درسِ نظامی کی تکمیل کی، والد ماجد حضرت بنوریؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹوریٹ کیا۔ متعدد کتابوں کے مؤلف ہیں۔ مکہ مکرمہ میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں، حضرت بنوریؒ حرمین کے اسفار میں ان کے ہاں قیام فرماتے تھے۔ بہت سے عرب علماء و مشائخ سے انہیں اجازتِ حدیث حاصل ہے، جن میں شیخ محمد یٰسین فادانی، شیخ سلیمان صنیع، شیخ عبدالحفیظ فاسی، شیخ عبدالستار دہلوی، شیخ عبدالباقی انصاری لکھنوی اور شیخ عمر بن حمدان المحرسی نمایاں ہیں۔ عرصہ دراز سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہونے کی بنا پر عرب و عجم کے اہلِ علم ان سے استفادہ کررہے ہیں، بارك اللہ في حیاتہ مع الصحۃ والعافیۃ.

۴- حضرت مولانا غلام محمد تائبی رحمۃ اللہ علیہ، جامعہ کے قدیم فاضل، حضرت والد ماجدؒ کے شاگرد و چچا سسر، حضرت مولانا شیر محمد تائبیؒ کے چھوٹے فرزند، میرے نانا حضرت مولانا گل محمدؒ کے چھوٹے بھائی اور میری والدہ ماجدہ دام ظلہا کے چچا تھے۔ جامعہ انوار العلوم سکھر کے سابق استاذ الحدیث، راسخ عالمِ دین، درویش صفت، صوفی منش، زہد پسند شخصیت تھے۔ ۱۶؍ رجب المرجب ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۸؍ جنوری ۲۰۲۴ء بروز جمعہ تقریباً ۸۷ سال کی عمر میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

..... ✽ ..... ✽ ..... ✽ .....

# حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری قُدس سرُّہٗ

## ایک مدبر، متقی اور درویش صفت مہتمم

(وفات: ۱۴۳۲ھ-۲۰۱۰ء)

مفتی عبدالرؤف غزنوی
سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند، انڈیا
حال استاذِ حدیث: جامعہ علوم اسلامیہ علّامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

راقم الحروف کو سال ۱۴۰۱ھ میں جماعتِ دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند کے اندر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دورِ اہتمام میں طالبِ علم کی حیثیت سے داخلہ نصیب ہوا، اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرُّہٗ نے خود ہی بخاری شریف کا افتتاح شیخ الحدیث و نائب مہتمم حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ کی موجودگی میں کرایا۔ اسی سال دارالعلوم دیوبند میں مجلسِ شوریٰ اور اہتمام کے درمیان اختلاف وخلفشار رونما ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر حضرت حکیم الاسلامؒ نے مجلس شوریٰ کو اپنا استعفا پیش کردیا، مجلس شوریٰ نے آپ کی پیرانہ سالی اور دارالعلوم دیوبند کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے استعفا منظور فرمالیا اور شوال ۱۴۰۲ھ مطابق اگست ۱۹۸۲ء میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ کو جو سال ۱۳۸۲ھ مطابق سال ۱۹۶۲ء کو مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے اور پھر رجب ۱۴۰۱ھ مطابق مئی ۱۹۸۱ء کو مددگار مہتمم کی حیثیت سے منتخب ہوچکے تھے، مستقل مہتمم مقرر کردیا۔ اس وقت سے اپنی وفات ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۰ء تک جو تقریباً تیس سال کا عرصہ ہے، آپ نے ایسی دیانت داری واخلاص، بصیرت وتدبر اور محنت وللّٰہیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت انجام دی کہ قریب سے دیکھنے والے ہر شخص کی زباں پر یہی رہا کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مؤیّد اور موفّق من اللہ مہتمم ہیں۔

آپ کے پیشرو اور سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرُّہٗ مختلف خصوصیات وامتیازات کے حامل تھے، وہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتوی قدّس سرّہ کے پوتے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے خلیفۂ مجاز، ایک لاثانی مقرر وخطیب، متبحر عالم، اپنے معاصر علماء میں سب سے زیادہ شہرت ومحبوبیت کے مقام پر فائز، ایک پرکشش شخصیت کے مالک اور نہایت تجربہ کار مہتمم تھے۔ جب کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ عالم و فاضل دارالعلوم دیوبند ہونے کے باوجود نہ تو مقرر تھے اور نہ ہی کسی اور خصوصی نسبت کے حامل، اور نہ ہی کوئی اعلیٰ اور امتیازی علمی مقام رکھتے تھے اور نہ شہرتِ عامہ سے بہرہ ور! اور آپ کو منصبِ اہتمام بھی ایک ایسے نازک وقت میں تفویض کیا گیا کہ دارالعلوم دیوبند سابقہ شدید خلفشار سے ابھی پوری طرح نکل بھی نہیں سکا تھا۔

مذکورہ صورتِ حال کو مدّنظر رکھ کر یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ ایک ایسی حالت میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسی شخصیت کی جگہ کو پُر کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تھا، البتہ بے حد مشکل ضرور تھا، چنانچہ بعض حلقوں نے اسی انتخاب پر حیرت وتعجب کا اظہار بھی کیا، لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ اخلاص وتقویٰ، للّٰہیت وتدبُّر، محنت وعرق ریزی اور حکمت ودلسوزی کے اس گمنام پیکر نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صرف یہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی کشتی کو مختلف خطرات سے بچا کر بحفاظت ساحل پر لگادیا، بلکہ مزید ترقیات سے بھی ہمکنار کردیا جس سے دارالعلوم دیوبند کے متعلقین اور مخلصین کے حلقوں میں یہ بات زبان زدِ خاص وعام رہی کہ دارالعلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام کے لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اکابر واسلاف کی دعاؤں اور مبارک توجُّہات کی برکت سے بالکل برمحل عمل میں آیا تھا۔

جب حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کو مجلس شوریٰ نے مستقل مہتمم کے طور پر منتخب فرمایا، اس وقت راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا۔ اسی دوران حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے حکم پر مجھے دارالعلوم دیوبند کی مسجد کا امام وخطیب مقرر کیا گیا اور فراغت کے بعد مدرس کی حیثیت سے انٹرویو کے بعد احقر کا انتخاب عمل میں آیا، انٹرویو لینے والے چار حضرات تھے جن میں سے ایک حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، دوسرے حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ شیخ الحدیث و نائب مہتمم، تیسرے حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحبؒ رکن مجلس شوریٰ اور چوتھے حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحبؒ رکن مجلس شوریٰ تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں راقم کی تدریس کا سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، اس دوران حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کو نہایت قریب سے دیکھنے اور ان کی عادات وخصائل سے واقف ہونے کا موقع ملا، وہ نہ تو دارالعلوم دیوبند میں کوئی کتاب پڑھاتے تھے اور نہ ہی میرے استاذ تھے، لیکن ان کی عظمت،

تقویٰ، سادگی، اخلاص، للّٰہیت اور پیرانہ سالی کے باوجود شب و روز دار العلوم دیوبند کے لیے ان کی مخلصانہ خدمتوں اور کاوشوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کا بے حد احترام تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ جتنا قریب سے انہیں دیکھنے اور ان کے حالات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہا اتنا ہی عقیدت میں اضافہ ہوتا رہا۔

کسی بھی مدرسہ کے منصبِ اہتمام یا کسی دوسرے انتظامی عہدے پر فائز ہونا اگرچہ اس اعتبار سے تو بہتر ہوتا ہے کہ وہ بشرطِ اخلاص و دیانت داری دین کی خدمت کا ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے، لیکن دوسرے اعتبار سے باعثِ تشویش بھی ہوتا ہے کہ خدانخواستہ اگر کوئی بے احتیاطی ہوئی یا امانت داری و انصاف سے کام نہیں لیا گیا تو پھر انسان کے لیے خطرناک بھی ہوتا ہے، اسی وجہ سے کسی ایسے عہدے پر فائز شخص اصحابِ بصیرت کی نظر میں عام طور پر قابلِ رشک نہیں ہوتا، بلکہ قابلِ رحم اور بعض دفعہ قابلِ افسوس بن جاتا ہے؛ اس لیے کہ انسان سے کبھی تو امانتوں میں بے احتیاطی ہوسکتی ہے، یا پھر اپنے عہدے کی وجہ سے غرور و استکبار اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرنے میں مبتلا ہوسکتا ہے، اور کبھی اقربا پروری یا شہرت پسندی کا شکار بن سکتا ہے، اور یہ تمام چیزیں ایک مسلمان کے لیے تباہی کے اسباب ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ کی دار العلوم دیوبند سے وابستگی اور پھر ان کے دورِ اہتمام کو قریب سے دیکھنے والے حضرات اس بات پر متفق نظر آتے تھے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا تمام خطرات سے محفوظ رکھا تھا، آپ تقریباً نصف صدی تک دار العلوم دیوبند سے اس طرح وابستہ رہے کہ تقریباً بیس سال تک مجلس شوریٰ کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے اور پھر تیس سال تک مہتمم کی حیثیت سے کام کیا، اس پورے عرصے میں ان کے موافق تو کیا کسی مخالف کی زباں سے بھی ایسا کوئی حرف ان کے متعلق نہیں سنا گیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ انہوں نے دار العلوم دیوبند سے کسی بھی قسم کا کوئی ذاتی مفاد حاصل کیا ہو، بلکہ وہ حتی الامکان دار العلوم دیوبند کی انتظامی خدمت کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر مالی خدمت بھی کرتے رہے۔ راقم الحروف مندرجہ ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ کے چند امتیازات وخصوصیات اس مقصد کے لیے قلمبند کررہا ہے کہ قارئینِ کرام اور بالخصوص اہلِ علم اور انتظامی عہدوں پر فائز حضرات ان سے استفادہ فرمائیں۔

## اخلاص وللّٰہیت

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ تیس سال تک دار العلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام پر فائز رہے اور پیرانہ سالی کے باوجود شب و روز محنت کی، اس طویل محنت کا کوئی

دنیوی معاوضہ انہوں نے قبول نہیں کیا، نہ کوئی تنخواہ لی اور نہ ہی کوئی اور مراعات! یہاں تک کہ احاطۂ مسجد کے جس کمرے میں دارالعلوم ہی کی خدمت کی خاطر قیام پذیر تھے، اس کے کرایہ اور بجلی کی مد میں اپنی ذاتی رقم دارالعلوم میں جمع کراکر رسید کٹواتے تھے، اور بالعموم جمعرات کو جب اپنے گھر بجنور تشریف لے جاتے تو آنے جانے کے لیے اپنی ذاتی گاڑی اور اپنا ہی پیٹرول استعمال فرماتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ بھائی محمد طاہر صاحبؒ نے جو دارالعلوم دیوبند میں آپ کے پیشکار (سکریٹری) تھے، بتایا کہ میں نے پیشکار ہونے کی حیثیت سے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کو بہت قریب سے تسلسل کے ساتھ دیکھا ہے، میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص نے دارالعلوم دیوبند کی ملکیت میں سے ایک پان کے بقدر بھی کوئی چیز مفت میں اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لائی ہے۔

پیشکار صاحبؒ نے مزید یہ بھی بتایا کہ جب شوریٰ کے اجلاس میں معزز اراکین ہندوستان کے کونے کونے سے دارالعلوم تشریف لاتے ہیں تو جب تک ان کا قیام دارالعلوم میں رہتا ہے، ان کے کھانے پینے کا خرچہ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنی ذاتی جیب سے ادا کرتے ہیں، حالانکہ وہ دارالعلوم ہی کے مہمان اور دارالعلوم ہی کی خدمت کے لیے تشریف لائے ہوتے ہیں، لیکن حضرت مہتمم صاحب دو وجہ سے ان کے کھانے پینے کا خرچہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں، ایک تو یہ کہ مہتمم ہونے کی حیثیت سے ان کو بھی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اور پھر کھانے میں شریک ہونا پڑتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ دارالعلوم کی ملکیت میں سے کھانے کا کوئی ایک لقمہ بھی مفت میں ان کے استعمال میں آجائے، دوسری وجہ یہ کہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان معزز اراکین کی ضیافت واکرام کی سعادت بھرپور طریقے سے وہ خود ہی حاصل کریں، اس لیے سارا خرچہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔

## دیانت داری وامانت داری

آپ سخاوت و ہمدردی میں مشہور ومعروف تھے، اور اپنا ذاتی مال بلا دریغ مہمانوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرتے تھے، لیکن دارالعلوم کے مالیات سے متعلق نہایت محتاط تھے، دارالعلوم کی کسی معمولی چیز کو بھی بے محل خرچ کرنے یا نظر انداز کردینے کے روادار نہیں تھے۔ جب دارالعلوم میں کوئی تعمیراتی کام ہوتا تو وہ براہِ راست نگرانی فرماتے، تاکہ کسی چیز کا ضیاع نہ ہو، اور اگر تعمیر کے بعد سریوں کے ٹکڑے یا دوسرا کوئی فضلہ سامان رہ جاتا اس کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے، بلکہ دارالعلوم کے کسی نہ کسی کام میں ضرور لے آتے۔

بعض دفعہ مطبخ جا کر طلبہ کے لیے تیار کی جانے والی روٹیوں اور سالن کا معاینہ فرماتے اور چیک کرنے کے لیے ایک آدھ لقمہ تناول فرماتے اور پھر اس کے بدلے میں بلا تاخیر اپنی جیب سے ایک پوری خوراک کی قیمت جمع کرا کر رسید کٹوا لیتے۔ اسی طرح اگر دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم بعض آنے والے معزز مہمانوں سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے اور ان کی دلجوئی کے لیے دارالعلوم کی طرف سے ان کے لیے تیار کیے جانے والے ناشتے یا کھانے میں شرکت فرماتے تو اس کی قیمت بھی بلا تاخیر اپنی جیب سے دارالعلوم میں جمع کرا دیتے۔

## اقربا پروری سے اجتناب

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کی دیانت داری کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ وہ اقربا پروری کے بالکل خلاف تھے اور اس کو ادارے کے لیے ایک خطرناک عمل تصور کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اقربا پروری کے سدّ باب کے لیے اپنے دورِ اہتمام میں یہ معمول بنایا تھا کہ دارالعلوم کے کسی استاذِ محترم یا دوسرے ملازم کے کسی فرزند ارجمند کو صلاحیت کے باوجود جب تک ان کے والد محترم دارالعلوم سے وابستہ ہوں دارالعلوم کا مدرس یا ملازم نہیں بنایا جائے گا، بلکہ اقارب کے علاوہ باصلاحیت افراد کو ترجیح دی جائے گی، اس معمول کو سب سے پہلے عملی جامہ خود حضرت والاؒ ہی نے پہنایا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنے تیس سالہ دورِ اہتمام میں اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کو دارالعلوم کا مدرس یا ملازم نہیں بنایا، یہاں تک کہ اپنے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمٰن صاحب قاسمی بجنوری مدظلہم فاضل دارالعلوم دیوبند کو بھی جن کی شرافت، تقویٰ، سنجیدگی، معاملہ فہمی اور خوش اخلاقی سے ان کا ہر جاننے والا واقف ہے نہ تو انہوں نے اپنی زندگی میں نائب مہتمم بنایا، نہ ہی دارالعلوم کے کسی بھی شعبے سے انہیں منسلک کر دیا، البتہ آپ کے وصال کے بعد مجلس شوریٰ نے دارالعلوم کی خیر خواہی کے لیے آپ کے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمٰن صاحب زید مجدہم کو مجلسِ شوریٰ کا رکن بنا دیا۔

ماہِ رجب ۱۴۳۵ھ کو اللہ تعالیٰ نے طویل فراق کے بعد اس عاجز کو ایک مرتبہ پھر چند دن کے لیے دارالعلوم دیوبند حاضری کا موقع عنایت فرمایا، اس وقت حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کا تو وصال ہو چکا تھا اور حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہم العالی منصبِ اہتمام پر فائز تھے، میں نے ان سے دفترِ اہتمام میں ان کے دونوں نائبین کی موجودگی میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے مذکورہ بالا معمول کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ معمول ان کے زمانے سے آج تک جاری ہے

اور چونکہ سب کو اس معمول کا علم ہے اور اس کے مطابق تعامل برقرار ہے، اس لیے اس کو چیلنج بھی نہیں کیا جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اس تعامل کو باضابطہ اور تحریری طور پر دستور کا حصہ اب تک نہیں بنایا گیا ہے۔

راقم کہتا ہے کہ اس تعامل کا مشاہدہ مذکورہ بالا سفر کے دوران میں نے خود اس طرح کیا کہ وہ اساتذۂ دارالعلوم دیوبند جو بقید حیات تھے ان کے صاحبزادگان میں سے کسی کو تدریس یا دارالعلوم کی ملازمت پر فائز نہیں دیکھا، حالانکہ ان میں سے کئی صاحبزادگان کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ ان میں صلاحیت وصالحیت دونوں موجود اور دارالعلوم کے مایۂ ناز فضلاء میں ان کو شمار کیا جاتا تھا اور وہ بعض دیگر مدارس میں کامیابی کے ساتھ پڑھا رہے تھے۔

## تواضع وخاکساری

اہتمام یا کسی بھی عہدے پر فائز ہونا مختلف وجوہات کی بنیاد پر انسان کے لیے ایک پرخطر وادی کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں ایک طرف اس کی دیانت داری وامانت داری کا امتحان ہوتا ہے تو دوسری طرف جاہ طلبی اور شہرت پسندی کی دلدل میں پھنسنے کا خطرہ بھی منڈلا رہا ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کو جہاں اللہ تعالیٰ نے دیانت داری وامانت داری کے میدان میں استقامت سے نوازا تھا، وہاں جاہ طلبی، شہرت پسندی اور خود پرستی سے بھی محفوظ فرمایا تھا۔

ان کی نشست وبرخاست، لباس وہیئت، طرزِ تکلم اور نقل وحرکت سے صاف طور پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ نمود ونا موری سے زیادہ گمنامی اور پوشیدگی کو پسند فرماتے تھے، نہ تو اپنی تعریف کے دلدادہ اور نہ ہی شہرت کے طلبگار تھے، وہ دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مسجد کے ایک معمولی کمرے میں مقیم تھے اور مسجدِ دارالعلوم میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے، امامت کی ذمہ داری چونکہ راقم الحروف کی تھی، اس لیے میں نے بار بار ایسا منظر دیکھا ہے کہ وہ مسجد میں آکر ایک نمایاں جگہ کی بجائے کسی گوشے میں نماز ادا کرنے کو ترجیح دیتے تھے، اور ایسا منظر بھی بار بار مشاہدہ میں آیا ہے کہ جدید طلبہ یا دارالعلوم کی زیارت کے لیے آئے ہوئے بعض دوسرے مدارس کے طلبہ جو حضرت والاؒ کو بذاتِ خود نہیں پہچانتے تھے، نماز کے وقت مسجد میں آتے ہوئے یا نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے ان کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے تھے، بلکہ بعض دفعہ جلدی میں ان سے ٹکراتے بھی تھے اور ان کی خاکساری وفروتنی کو دیکھ کر وہ ہرگز یہ تصور نہیں کرسکتے تھے کہ یہ شخص اس عظیم بین الاقوامی دینی درسگاہ کے عظیم المرتبت مہتمم ہوں گے، اور نہ وہ خود کسی کو اس کا احساس دلانے کی کوشش فرماتے۔

## تقویٰ اور رجوع الی اللہ

آپ کے تیس سالہ دورِ اہتمام کی ابتدا سے دس سال تک راقم الحروف مدرس اور امام وخطیب کی

حیثیت سے دار العلوم دیوبند میں مقیم رہا، اس دوران حضرت والاؒ کو بہت قریب سے دیکھا، آپ کی عمر اس وقت ستر اور اسّی سال کے درمیان چل رہی تھی، اس پیرانہ سالی میں بھی تمام نمازیں جماعت وتکبیر تحریمہ کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا آپ کا معمول رہا، اس کے علاوہ نوافل، ذکر واذکار، اوراد ووظائف اور رجوع الی اللہ کے بھی پابند رہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل ایک چشم دید واقعہ نمونے کے طور پر قلمبند کیا جا رہا ہے:

دار العلوم دیوبند کی مایۂ ناز جامع مسجد رشید کی بنیاد بروز جمعہ ۲۳/ ۷/ ۱۴۰۶ھ مطابق ۴/ ۴/ ۱۹۸۶ء میں رکھی گئی، اس کے بعد باقاعدہ تعمیری کام شروع ہوا تو حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ نے احقر پر اعتماد کرتے ہوئے اس مسجد کی نگرانی اور تعمیری سامان کی دیکھ بھال ایک اضافی کام کے طور پر میرے سپرد کر دی، مجھے چونکہ نہ تو اس کام کا کوئی تجربہ تھا اور نہ دلچسپی؛ اس لیے میں نے معذرت کرتے ہوئے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ تدریس وامامت کے ساتھ ایسا کام کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے، لیکن حضرت والاؒ نے ہمت دلاتے ہوئے میری معذرت کا راستہ بند کر دیا اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کا حکم دے دیا۔

میں نے حسب الحکم نگرانی شروع کی، لیکن چند ہی روز کے اندر اندازہ ہوا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں، مطالعہ میں دشواری اور اسباق کی تیاری میں پریشانی محسوس ہو رہی ہے، تو میں نے اس کام سے معذرت پیش کرنے کے لیے حضرت مہتمم صاحبؒ سے دفتر اہتمام کی بجائے ان کے کمرے میں چاشت کے وقت خصوصی ملاقات کا ارادہ کیا؛ اس لیے کہ دفتر اہتمام میں رش کی وجہ سے یکسوئی کے ساتھ بات نہ ہو پاتی۔ جب میں چاشت کے وقت ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو سلام کرنے اور اجازت لینے سے قبل میں نے دیکھا کہ وہ چاشت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جائے نماز پر قبلہ رخ بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے ہوئے زار وقطار اپنے رب کے سامنے رو رہے ہیں، انہوں نے مجھے نہیں دیکھا، لیکن میں نے اس منظر کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے پیچھے ہٹنے اور انتظار کرنے کو مناسب سمجھا، اس دوران مجھ پر یہ تصور کرتے ہوئے رقّت طاری ہوگئی کہ یہ اللہ کے نیک بندے اس عمر میں ایک طرف تو شب وروز دار العلوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے اتنا گہرا تعلق کہ اپنی تنہائی میں پروردگار کے سامنے اتنی لجاجت کے ساتھ رو رو کر دعا کر رہے ہیں! اور یہ بھی ذہن میں آیا کہ جب ادارے کے مہتمم و سربراہ کا اللہ تعالیٰ سے اتنا گہرا تعلق ہو تو ان شاء اللہ وہ ادارہ ترقی کے راستے پر گامزن رہے گا اور کوئی بھی بادِ مخالف اس کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔ تھوڑی دیر تک اس تصور میں ڈوبا رہا اور جب اندازہ ہوا کہ آپ اپنے معمول سے فارغ ہو گئے ہوں گے تو آگے بڑھ کر سلام کرنے کے بعد اندر جانے کی اجازت طلب کی،

انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دی۔

اندر جانے کے بعد میں نے حضرت والا سے بڑے ادب کے ساتھ جامع مسجد رشید کے تعمیری کام کی نگرانی سے معذرت پیش کر دی، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک غیبی مدد تھی کہ مجھ پر رقت کی جو کیفیت حضرت مہتمم صاحبؒ کی دعا کی کیفیت کو ان کی لاعلمی میں دیکھ کر طاری ہوگئی تھی، ابھی اس کے کچھ اثرات میرے چہرے اور شاید آنکھوں میں بھی باقی تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے میری کیفیت کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ شاید میں مذکورہ کام کی نگرانی سے اس حد تک پریشان ہوں کہ میری ایسی کیفیت ہوگئی ہے؛ لہٰذا انہوں نے میری معذرت منظور فرما کر مذکورہ کام حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی زیدمجدہم موجودہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حوالے کر دیا، جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت، مسلسل محنت اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

## ایک مؤدبانہ التماس

اہلِ علم اور بالخصوص اربابِ انتظام حضرات سے یہ مؤدبانہ گزارش کی جاتی ہے کہ اپنے اکابر کے حالات، ان کی زندگیوں کے نقوش، ان کی احتیاط و دیانت داری، ان کے اخلاص وللّٰہیت اور ان کے رجوع الی اللہ کی کیفیت کو ہمیشہ یاد رکھا جائے، اور ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے، ان کے حالات کا تذکرہ اپنی مجالس وگفتگو کا حصہ بنا دیا جائے اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو ان کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی عادات وخصائل کو اپنانے کی ترغیب دی جائے، اس سے کافی حد تک فائدہ ضرور ہوتا ہے: ’’وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔‘‘

## وفات اور نمازِ جنازہ

اللہ تعالیٰ کا حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے ساتھ ایک خصوصی فضل وکرم کا معاملہ یہ رہا کہ انہوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور آخر تک حواس برقرار رہے اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت للہ فی اللہ کرتے ہوئے درست فیصلے کرتے رہے۔ ان کی زندگی اور اعمالِ صالحہ کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل وہ حدیث یاد آتی ہے جو امام ترمذیؒ نے حَسَن سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں بہتر آدمی کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’من طال عمرہٗ و حَسُنَ عَمَلُہٗ‘‘ (جس کی عمر لمبی اور عمل نیک ہو)، مذکورہ حدیث کی روشنی میں قوی اُمید کی جاسکتی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں

شامل ہوں گے۔

آپ نے یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ھ مطابق آٹھ دسمبر ۲۰۱۰ء کو بروز چہار شنبہ سن ہجری کے اعتبار سے تقریباً سو سال کی عمر میں اور سن میلادی کے اعتبار سے تقریباً چھیانوے سال کی عمر میں بجنور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا، نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند میں ہزاروں علماء، طلبہ اور عامۃ المسلمین نے آپ کے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمٰن صاحب قاسمی بجنوری زید مجدہم کی اقتداء میں ادا کی اور مزارِ قاسمی میں تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کے اعمالِ صالحہ اور طویل دینی خدمات کو قبول فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور پسماندگان و متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

# گرمی اور موسم گرما

مولانا ابوخالد قاسمی
غازی آباد، ہندوستان

ان دنوں ہم موسمِ گرما کی شدید تپش اور جھلسا دینے والی دھوپ کا سامنا کر رہے ہیں، جس کی گرمی جسموں کو جھلسا دینے والی محسوس ہوتی ہے، لیکن اہلِ بصیرت کے لیے اس شدید گرمی میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں، نصیحتیں اور عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ بہت سے لوگ اس گرمی کی حقیقت سے واقف نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی کہ اے میرے رب! میرا ایک حصہ دوسرے حصے کو کھا رہا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے سال میں دو سانس لینے کی اجازت دی؛ ایک سانس سردیوں میں اور ایک سانس گرمیوں میں، لہٰذا تم جس شدید گرمی کو محسوس کرتے ہو وہ جہنم کے گرم سانس کا اثر ہے، اور جس سخت سردی کو محسوس کرتے ہو وہ اس کے زمہریر (شدید سرد حصے) کا اثر ہے۔''

ایک دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''جب گرمی بہت زیادہ ہو جائے تو نماز کو کچھ ٹھنڈا ہونے تک مؤخر کر لیا کرو، کیونکہ سخت گرمی جہنم کی بھاپ میں سے ہے۔''

سوچیے! جس گرمی کو ہم برداشت نہیں کر پاتے، جس سے بچنے کے لیے سایہ اور ٹھنڈا پانی تلاش کرتے ہیں، وہ تو جہنم کی صرف ایک سانس ہے، پھر خود جہنم کی گرمی کیسی ہوگی؟

بعض سلف صالحین فرمایا کرتے تھے کہ: اگر اہلِ جہنم کو جہنم سے نکال کر دنیا کی آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ اسے ٹھنڈی محسوس کریں گے اور برسوں تک اسی میں آرام سے رہیں گے۔

## آخرت کی آگ کی ہولناکی اور اس کی شدت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’تمہاری یہ دنیا کی آگ، جسے انسان بھڑکاتے ہیں، جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے صرف ایک حصہ ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہی آگ تو (عذاب کے لیے) کافی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم کی آگ کو اس پر انہتر حصوں کی برتری دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر حصہ اسی دنیا کی آگ جیسی حرارت رکھتا ہے۔‘‘ (بخاری، مسلم)

جب دنیا کی آگ جس کی تپش انسان برداشت نہیں کر پاتا، جہنم کی آگ کا صرف سترواں حصہ ہے، تو خود جہنم کی آگ کی شدت اور ہولناکی کا کیا عالم ہوگا، جسے اللہ تعالیٰ نے کافروں اور نافرمانوں کے لیے تیار فرمایا ہے؟ سلفِ صالحین کا حال یہ تھا کہ جب وہ ٹھنڈا پانی پیتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور انہیں اہلِ جہنم کی وہ حسرت یاد آ جاتی، جب وہ اہلِ جنت سے فریاد کریں گے:

’’ہم پر کچھ پانی ڈال دو یا اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دو۔‘‘ (الاعراف: ۵۰)

اسی طرح جب گرمیوں کی تیز اور جھلسا دینے والی ہوائیں ان کے جسموں سے ٹکراتیں تو وہ اپنے دل میں کہتے: اگر یہ صرف جہنم کی ایک سانس کا اثر ہے، تو پھر خود جہنم کی آگ کی شدت کیسی ہوگی!

## موسمی تغیرات اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی

محترم قارئین! ان دنوں ہم ایسے موسمی حالات کا مشاہدہ کر رہے ہیں، جن کی مثال ماضی میں بہت کم ملتی ہے۔ شدید گرمی کی لہروں نے یورپ جیسے خطے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، جو ہمیشہ معتدل آب و ہوا کے لیے مشہور رہا ہے۔ فرانس، اسپین، اٹلی اور برطانیہ میں درجۂ حرارت چالیس ڈگری سینٹی گریڈ تک بلکہ اس سے بھی تجاوز کر گیا۔ اسی طرح ایشیا کے متعدد ممالک، جیسے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، میانمار (برما) اور افغانستان وغیرہ بھی شدید گرمی کی لپیٹ میں ہیں۔ اس کے نتیجے میں کئی علاقوں میں تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے، سخت طبی انتباہات جاری کیے گئے، اور اقوامِ متحدہ کی مختلف رپورٹیں اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ مستقبل میں درجۂ حرارت مزید نئے ریکارڈ قائم کر سکتا ہے۔ کیا ان واقعات اور بدلتے حالات میں اہلِ عقل کے لیے کوئی عبرت نہیں؟ کیا ان علاقوں میں، جو کبھی ٹھنڈے سمجھے جاتے تھے، شدید گرمی کی وجہ سے لوگوں کی اموات اس عظیم دن کی یاد دہانی نہیں کراتیں جب انسان میدانِ حشر میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوگا؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’’جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔‘‘

(سورۂ نور: ۲۴)

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن سورج مخلوق کے اتنا قریب کر دیا جائے گا کہ وہ صرف ایک میل کے فاصلے پر ہوگا، پھر لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوں گے؛ کسی کا پسینہ ٹخنوں تک ہوگا، کسی کا گھٹنوں تک، کسی کا کمر تک، اور بعض ایسے ہوں گے جنہیں پسینہ پوری طرح ڈھانپ لے گا۔'' (مسلم)

لہٰذا اے وہ شخص! جو دنیا کی چند لمحوں کی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتا، ذرا سوچ کہ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب قیامت کے دن سورج سروں کے بالکل قریب آ جائے گا اور میدانِ حشر میں طویل انتظار کرنا پڑے گا۔

## گرمی مومن کے لیے غنیمت ہے، رکاوٹ نہیں

کیا گرمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رکاوٹ ہے؟ یا اہلِ ایمان کے لیے نیکی کمانے کا ایک سنہری موقع؟ جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہیں نہ مال و دولت کا افسوس تھا اور نہ اولاد کا، بلکہ انہیں اس بات کا غم تھا کہ اب وہ راتوں کے قیام، اہلِ علم کی مجلسوں میں زانو بہ زانو بیٹھ کر علم حاصل کرنے، اور سخت گرمی کے دنوں میں روزہ رکھ کر پیاس برداشت کرنے جیسی عظیم عبادتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

''گرمی کے سخت دنوں میں روزہ رکھا کرو، تاکہ قیامت کے دن کی گرمی سے بچ سکو، اور رات کی تاریکی میں دو رکعت نماز پڑھا کرو، تاکہ قبر کی تاریکی کے لیے سامان ہو جائے۔''

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، سخت گرمی کا دن تھا، یہاں تک کہ گرمی کی شدت کے باعث لوگ اپنے سروں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ اس دن ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی روزے سے نہ تھا۔''

جتنی زیادہ مشقت ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ اجر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اجر مشقت کے بقدر ہوتا ہے۔ شاید یہ سخت گرمی ہمیں اس عظیم منظر کی یاد دلانا چاہتی ہے، جب لوگ میدانِ حشر سے اپنے اپنے انجام کی طرف روانہ ہوں گے؛ ایک جماعت جنت کی طرف اور دوسری جہنم کی طرف۔

قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی، اور اس دن دوپہر ہونے سے پہلے ہی اہلِ جنت اپنی جنت کی نعمتوں میں آرام کر رہے ہوں گے اور اہلِ جہنم اپنے ٹھکانے میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اسی حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:

’’اس دن جنت والے بہترین ٹھکانے میں ہوں گے اور نہایت عمدہ آرام گاہ میں۔‘‘ (فرقان:۲۴)

## شدید گرمی میں نیکی اور پانی پلانے کا عمل

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جلداُ کتا جاتا ہے، اور اس کی نادانی یہ ہے کہ وہ کسی ایک حالت پر راضی نہیں رہتا، چنانچہ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

يتمنى المرء في الصيف الشتاء    فإذا جاء الشتاء أنكره
فهو لا يرضى بحال واحد    قتل الإنسان ما أكفره

’’گرمی میں وہ سردیوں کی آرزو کرتا ہے، اور جب سردی آتی ہے تو اسی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی ایک حالت پر کبھی راضی نہیں رہتا، انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔‘‘

لیکن ایک سمجھ دار مؤمن گرمی کی شدت پر بار بار شکوہ نہیں کرتا، بلکہ اسے نیکی کمانے کا موقع سمجھتا ہے، خصوصاً ایسے اعمال اختیار کرتا ہے جن کی اس موسم میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ان اعمال میں سب سے اہم یہ ہیں کہ لوگوں کے لیے سایہ فراہم کیا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، خواہ وہ فقیر ہوں یا نہ ہوں، بلکہ جانوروں اور پرندوں کو بھی پانی پلایا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ہر جاندار کو پانی پلانے میں اجر وثواب ہے۔

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

’’ایمان کی چند اہم خصلتوں کو مضبوطی سے اختیار کرو: گرمی کے موسم میں روزہ رکھنا، اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں جہاد کرنا، اور سردی کے دنوں میں اچھی طرح وضو کرنا۔‘‘

## سورج بھی سجدہ کرتا ہے، پھر تکبر کیسا؟

یہ عظیم الشان سورج، اپنی بے پناہ جسامت اور جھلسا دینے والی حرارت کے باوجود اہلِ بصیرت کے لیے ایک عظیم عبرت ہے۔ وہ ہر روز اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور اپنے رب کا پوری فرمانبرداری اور عاجزی کے ساتھ حکم مانتا ہے۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ سورج غروب ہونے کے وقت رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ’’کیا تم جانتے ہو کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جاتا ہے، یہاں تک کہ عرشِ الٰہی کے نیچے سجدہ کرتا ہے،

پھر طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے تو اسے اجازت دے دی جاتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا، مگر اس کا سجدہ قبول نہیں کیا جائے گا، اور اجازت طلب کرے گا، مگر اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس سے کہا جائے گا: جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ، چنانچہ وہ مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا۔ یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مفہوم ہے:

''اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چل رہا ہے، یہ زبردست، خوب جاننے والے اللہ کی مقرر کی ہوئی تقدیر ہے۔'' (یٰس:۳۸)

جب اتنی عظیم مخلوق، یعنی سورج ہر روز اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے، تو پھر بعض انسان اپنے پروردگار کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیوں کرتے ہیں؟ اس سے پہلے کہ وہ وقت آجائے جب انہیں سجدہ کرنے کی دعوت دی جائے گی مگر وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور انہیں سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا، تو وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی، ذلت ان پر چھارہی ہوگی، حالانکہ دنیا میں جب وہ صحیح سلامت تھے تو انہیں سجدہ کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔'' (قلم:۴۲-۴۳)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے۔'' (مرسلات:۴۸)

لہٰذا اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور اس شدید گرمی کو، جو سورج کی تپش سے تمہیں محسوس ہوتی ہے، اپنی آخرت کی یاد اور عبرت کا ذریعہ بناؤ۔ جب دنیا کی یہ گرمی جو جہنم کی صرف ایک سانس ہے، اتنی ناقابلِ برداشت ہے، تو پھر قیامت کے دن جہنم کی اصل آگ کی شدت کیسی ہوگی؟

یہ بھی یاد رکھو کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، ہمیشہ رہنے کی منزل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل اور تماشا ہے، جبکہ اصل اور ہمیشہ کی زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے، کاش! یہ لوگ جان لیتے۔'' (العنکبوت:۶۴)

پس ان قیمتی دنوں کو اللہ کی اطاعت میں گزارو، اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرو، کیونکہ حقیقی عقل مند وہی ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے آنے والے کل (آخرت) کے لیے کیا سامان آگے بھیجا ہے؟ اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے تمام

اعمال سے خوب باخبر ہے۔‘‘ (حشر:۱۸)

ہم اللہ تعالیٰ سے جہنم کی گرمی، عذابِ قبر، زندگی اور موت کے فتنوں، اور مسیح دجال کے شر سے پناہ مانگتے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں جہنم کی آگ سے محفوظ فرما، اور اپنی بے پایاں رحمت سے ہمیں جنت میں داخل فرما، اے سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والے!

## وضاحتِ شبہ

سائنس کے مطابق سورج اور زمین کی قربت اور دوری موسم پر اثر انداز ہوتی ہے، جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ گرمی اور سردی جہنم کے سانسوں میں سے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا۔

## جوابِ شبہ

**پہلی بات:** جہنم کا اپنے رب سے شکایت کرنا عقل یا سائنس کے خلاف نہیں، کیونکہ یہ امورِ غیبیہ میں سے ہے، جنہیں ہم دنیوی عقل یا سائنسی آلات کی بنیاد پر نہیں پرکھ سکتے۔

**دوسری بات:** حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وجہ بیان فرمائی جو اس بات کے منافی نہیں کہ اس کی دوسری وجوہات بھی ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے انعام الباری دیکھیں۔

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

# استاذ اور تربیت نسل

مولانا عبدالمتین
کراچی

## چند اہم اصول اور رہنما نکات

۱- تربیت کا اصل مرکز گھر ہے، لیکن اس تربیت کی مرمت، جانچ اور نکھار استاذ کی بھی ذمہ داری ہے۔

۲- آج ہمارا معاشرہ گھریلو تربیت کی کمزوری کا شکار ہے، اسی لیے اساتذہ پر یہ ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔

۳- استاذ کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ:

''میرا کام صرف نصاب مکمل کرانا اور کاغذی رزلٹ بہتر دینا ہے۔''

۴- حالانکہ ایک استاذ کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے طالب علم کے اندر چھپی صلاحیتوں، رجحانات اور جوہر کو پہچانے، پھر اسے ان صلاحیتوں کے درست استعمال کا شعور دے۔

۵- طلبہ کی عقل اگرچہ کمزور ہوتی ہے، لیکن ان کے احساسات بہت طاقتور ہوتے ہیں، وہ چیزوں کو گہرائی سے دیکھتے، محسوس کرتے، مشاہدہ کرتے اور سمجھتے ہیں، اسی لیے طالب علم صرف استاذ کی باتیں نہیں سنتا، بلکہ اس کی پوری شخصیت کا مطالعہ کرتا ہے۔

۶- والدین کے بعد اگر کوئی شخصیت طالب علم پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے تو وہ استاذ کی شخصیت ہے۔

۷- استاذ کا لباس، رویہ، اخلاق، غصہ پر قابو، پڑھانے کا انداز، نقل و حرکت، گفتگو کا طریقہ، بات سننے کا حوصلہ، مختلف تبصرے اور تجزیے، دینی حالت، معاشرتی کردار، گھریلو زندگی وغیرہ یہ سب چیزیں طلبہ کے علم میں بھرپور ہوتی ہیں۔

۸- وہ خاموش ضرور ہوتے ہیں، مگر بے خبر نہیں ہوتے، اس لیے طلبہ کو ''گونگا بہرا'' سمجھنے کی غلط فہمی سے نکلنا ضروری ہے۔

۹۔طلبہ کی خاموشی ہمیشہ رضامندی نہیں ہوتی۔

اکثر وہ اپنی کمزوری، ماحول کے دباؤ یا استاذ کے احترام کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں، لیکن دلوں کو جیتنے اور بات منوانے والی چیز صرف ''مضبوط کردار'' ہی ہے۔

۱۰۔ جو استاذ نرمی سے محروم ہے، وہ بہت سی خیر سے محروم رہتا ہے، کیونکہ جو کام نرمی سے ہوسکتا ہے، وہ سختی سے کبھی نہیں ہوسکتا۔ البتہ نرمی کا مطلب انتہائی بے تکلفی کا تعلق نہیں ہے، طالب علم آپ کا شاگرد ہے، دوست نہیں ہے اور بے جا بے تکلفی دوستوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔

۱۱۔تربیت کا اصل محور ابتدائی عمر کے بچے ہیں، سات سال کی عمر تک بچے کی شخصیت کی بنیادیں مضبوط ہوجاتی ہیں، اس کے بعد تربیت ممکن تو رہتی ہے، لیکن نسبتاً محدود ہوجاتی ہے، اس لیے ایک استاذ کو اس مرحلے میں زیادہ محنت اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۲۔نظم وضبط سکھانا استاذ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے، کیونکہ بدنظم انسان علم اور ذہانت کے باوجود عملی زندگی میں ناکام رہتا ہے۔

۱۳۔واضح رہے استاذ صرف الفاظ منتقل نہیں کرتا، بلکہ اپنا کردار منتقل کرتا ہے۔

۱۴۔اگر استاذ غیبت کرتا ہے تو طلبہ بھی سیکھتے ہیں، تجسس اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے تو طلبہ بھی یہی کرتے ہیں، گالم گلوچ کرتا ہے تو یہی زبان طلبہ میں منتقل ہوتی ہے، چغل خوری کرتا ہے تو طلبہ بھی اسی روش پر چلتے ہیں، اسی لیے استاذ کو اپنی اصلاح کو تعلیم سے مقدم رکھنا چاہیے۔

۱۵۔موجودہ دور میں جن صفات کی شدید ضرورت ہے، کیونکہ یہ چند اوصاف معاشرے سے تیزی سے کم ہوتے جارہے ہیں۔ استاذ کو چاہیے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ ان امور پر محنت کرے اور طلبہ کی شخصیت میں انہیں پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرے:

| | | | |
|---|---|---|---|
| ایثار | رہنمائی | خوداعتمادی | توکل |
| خدمتِ خلق | ادب | نظم وضبط | روحانیت |
| حوصلہ افزائی | بلند ہمتی | شکرگزاری | مایوسی سے بچاؤ |
| صبروتحمل | صلہ رحمی | رحم وکرم | باہمی تعاون |
| موبائل کا کم استعمال | درگزر اور معافی | والدین کے مقام کی پہچان | رشتوں کا احترام |

استاذ اگر ان صفات کو اپنی زندگی میں پیدا کرلے تو یہی صفات خاموشی کے ساتھ نسلوں میں منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی تعلیم وتربیت کی توفیق عطا فرمائے جو صرف ذہن نہیں، بلکہ کردار کی بھی تعمیر کرسکے۔

# خدمتِ خلق

مولانا محمد راشد شفیع
کراچی

## اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی پہچان

انسانیت کی اصل خوبصورتی صرف اپنے لیے جینے میں نہیں، بلکہ دوسروں کے کام آنے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی اور تعاون کا حکم دیا ہے، جو شخص اللہ کی مخلوق کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہے اور لوگوں کی آسانی کے لیے کوشش کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مستحق بنتا ہے۔ ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ کسی ضرورت مند کا ہمارے پاس کسی کام کے لیے آنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک موقع اور نعمت ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے، کیونکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد کے لیے اپنے دوسرے بندوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ خدمتِ خلق صرف مال خرچ کرنے کا نام نہیں، بلکہ اچھا اخلاق، نرم گفتگو، رہنمائی اور کسی کی پریشانی دور کرنا بھی عظیم نیکی ہے۔ ایسے لوگ معاشرے میں محبت، اُخوت اور سکون پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو دل مخلوق کے لیے نرم ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا خدمتِ خلق، ایثار اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کے بارے میں مختلف آیات میں ترغیب ارشاد فرمائی ہے، چناں چہ ارشادِ باری ہے:

۱۔ ’’اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔‘‘ (المائدہ:۲)

۲۔ ’’اور وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود محتاج ہوں۔‘‘ (الحشر:۹)

۳۔ ’’اور جو شخص کسی ایک جان کو زندگی بخشتا ہے، گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔‘‘ (المائدہ:۳۲)

۴۔ ’’اور جو کچھ تم بھلائی کا کام کرتے ہو، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔‘‘ (البقرہ:۲۱۵)

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے انسانیت کی بھلائی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا اہلِ ایمان کی شان ہے۔ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا اعلیٰ اخلاق اور ایمان کی علامت ہے۔ کسی انسان کی پریشانی دور کرنا اور اس کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ بندہ جو بھی بھلائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر رہتے ہیں اور اس کا اجر عطا فرماتے ہیں۔ خدمتِ خلق کے ذریعے معاشرے میں محبت، اخوت اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے، اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی مخلوق کے کام آئے اور اس عظیم نیکی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے۔

رسول اللہ ﷺ نے خدمتِ خلق کے ایسے اعلیٰ نمونے قائم فرمائے کہ انسانی تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اعلانِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کی پوری زندگی اللہ کی مخلوق کی خیرخواہی، ہمدردی اور مدد سے بھرپور نظر آتی ہے، بلکہ نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہتے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے، معاشرے کے یتیموں، کمزوروں، بیواؤں، محتاجوں اور ظلم کا شکار افراد کی مدد کرنا آپ ﷺ کے مبارک اوصاف میں شامل تھا، حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا ایک اہم مقصد انسانیت کی بھلائی اور مخلوقِ خدا کی خدمت ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

’’قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا، لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان کہے گا: تو سارے جہاں کا پروردگار ہے تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے، لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں گیا؟ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، لیکن تو نے کھانا نہیں دیا۔ انسان عرض کرے گا: اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا، لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا؟ اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ انسان عرض کرے گا: اے دونوں جہاں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا اور میں تجھے کیسے پانی پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا، لیکن تو نے

اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا، اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض)

حضور نبی اکرم ﷺ نے خدمتِ خلق کو روحانی و اخلاقی بنیاد فراہم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''لوگوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کو نفع پہنچاتا ہے۔''

(کنزالعمال، کتاب المواعظ والرقائق، باب خطب النبي ومواعظه، ج: ۱٦، ص: ٥٤)

دوسرے مقام پر فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ (بھلائی) نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔''

(سنن الترمذي، كتاب السير، باب في التحريق والتخريب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے، زمین والوں پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔'' (مسند أحمد بن حنبل)

خدمتِ خلق کا سب سے زیادہ فائدہ خدمت کرنے والے کو ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی مدد فرماتا ہے، اس کے اپنے کام بھی ہوجاتے ہیں اور آخرت کا اجر اس کے علاوہ ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔'' (سنن الترمذي، كتاب البر، باب ماجاء في الستر على المسلم)

ایک اور موقع پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس سے کنارا کرتا ہے۔ جو آدمی اپنے بھائی کا کوئی مسئلہ حل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بھی حاجت پوری کرتا رہتا ہے اور جس نے اپنے بھائی کے دکھ میں حصہ لیا، اللہ قیامت کے دن اس کی مشکل میں سے ایک مشکل کو دور کردے گا اور جس نے دنیا میں اپنے بھائی کی پردہ پوشی کی، اللہ قیامت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' (صحیح مسلم، کتاب البر، باب تحریم ظلم المسلم)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ خلق اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی انسانیت کی خیرخواہی، ہمدردی اور مدد کا عظیم نمونہ پیش فرمایا۔ اسلام نے بیماروں کی عیادت، بھوکوں کو کھانا کھلانے، پیاسوں کو پانی پلانے اور ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے

کو بڑی فضیلت عطا کی ہے۔ مخلوقِ خدا کی خدمت دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔ دوسروں کے لیے بھلائی چاہنا، رحم وشفقت کرنا اور تکلیف دور کرنا کامل ایمان کی علامت ہے۔ جو بندہ اللہ کے بندوں کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں۔ خدمتِ خلق نہ صرف دنیا میں محبت اور سکون کا ذریعہ ہے، بلکہ آخرت میں عظیم اجر کا سبب بھی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی خدمتِ خلق کے جذبہ سے ہر وقت سرشار رہتے تھے، یہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت اور تربیت اور آپ علیہ السلام کے ارشادات پر کامل عمل کا نتیجہ تھا، چناں چہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت لگاتے ہوئے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام صرار پہنچ گئے، وہاں دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکارہی ہے اور اس کے پاس دو تین بچے رو رہے ہیں۔ قریب جا کر حقیقت دریافت کی تو اس عورت نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے، ان کو بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وقت اُٹھے، مدینہ آکر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اپنے غلام اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا کہ میں لے کر چلتا ہوں۔ فرمایا: ہاں، لیکن تم قیامت کے دن میرا بار نہیں اُٹھاؤ گے۔ (شبلی نعمانی، الفاروق، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰۲)

خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بڑے تاجر تھے اور اپنے مال کا بڑا حصہ غریبوں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کر دیتے تھے۔ یہی اسوہ خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کا بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''مسکینوں کے لیے جعفر بن ابی طالب بہترین انسان تھے۔ وہ ہمارے پاس آتے تھے اور ان کے گھر میں جو کچھ ہوتا تھا وہ ہم لوگوں کو کھلاتے تھے۔''

(صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، باب الحلوا والعسل)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں صحیح بخاری میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک کوئی مسکین ان کے کھانے میں شریک نہ ہو جائے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ معروف تابعی ابومحذورہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس میں بیٹھا تھا کہ صفوان بن امیہ کھانے کی ایک دیگ کے ساتھ آئے جسے کچھ لوگ اٹھائے ہوئے تھے، ان لوگوں نے وہ دیگ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے پاس پڑوس کے غرباء ومساکین اور لوگوں کے غلاموں

کو بلالیا اوران کے ساتھ مل کر کھانا تناول فرمایا۔‘‘

(الأدب المفرد، باب هل يجلس خادمه معه إذا أكل)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

’’معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے افضل ترین نوجوانوں میں سے تھے۔ جب بھی کوئی سائل ان سے کچھ مانگتا تو اس کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ خدمت خلق کے لیے انھوں نے اتنے قرضے لیے کہ ان کا سارا مال ختم ہوگیا۔ بالآخر انھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ قرض داروں سے تھوڑی تخفیف کرادیں، لیکن قرض دار اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بچا ہوا مال بیچ کر ان میں تقسیم کردیا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔‘‘ (صفة الصفوة ، ج:۲، ص: ۱۹۷)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ جب کوئی مصیبت زدہ ان کے پاس اپنی فریاد لے کر آتا تو وہ ہر طرح سے اس کی مدد فرماتے۔ خدمت خلق کے اتنے حریص تھے کہ اعتکاف سے نکل کر لوگوں کی مدد کے لیے کھڑے ہوجاتے۔ ایک مرتبہ وہ مسجد نبوی میں اعتکاف کررہے تھے کہ ایک شخص وہاں آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے غم زدہ دیکھا تو فرمایا: اے شخص میں تم کو غمگین دیکھتا ہوں؟ اس نے کہا کہ ہاں اے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی! فلاں آدمی کا میرے اوپر قرض ہے اور اسے ادا کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے اعتکاف سے نکل آئے اور اس محتاج کے ساتھ چل پڑے اور فرمانے لگے کہ میں نے اس قبر کے مکین (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

’’جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں چل پڑا اور اس کی ضرورت پوری کی تو اس کے لیے دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہے۔‘‘ (طبراني، بيهقي، المستدرك للحاكم)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی خدمت خلق کے جذبے سے سرشار فرمائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ میں جو تعلیمات ہیں، ان پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

# حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن و جمال

مولانا قاری محمد سلمان عثمانی

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کا کیا کہنا!!! اللہ جل شانہٗ نے روئے زمین پر آپ سے حسین کسی کو پیدا ہی نہیں کیا، اس جہان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ثانی نہیں، نہ ہی قیامت تک کوئی آپ کا ثانی ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال ایسا کہ چودھویں رات کا چاند بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صورت، سیرت اور کمالات میں گویا ہر چیز میں سردار ہیں، سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات و خصائص اور باطنی فضائل و محامد کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثل حسن و جمال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ جاوید معجزہ ہے، جس کا تذکرہ کم و بیش سیرت کی تمام کتب میں موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کو جاننے کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ طیبہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ سیرت کے ساتھ صورت سے بھی پیار پیدا ہو۔ شمس الدین شیرازی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کو بیان کرنے میں زبان و بیان کی بے مائیگی کا اظہار ان اشعار میں کیا:

يَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَ يَا سَيِّدَ الْبَشَر　　مِنْ وَّجْهِكَ الْمُنِيْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَرُ

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ　　بعد از خدا بزرگ توئی، قصه مختصر

ترجمہ: ''اے صاحبِ جمال اور اے عالم بشریت کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ کے روشن کرنے والے رخِ انور کے فیضان سے چاند کو روشن کیا گیا ہے، آپؐ کی تعریف و توصیف ممکن ہی نہیں ہے، جیسا کہ اس کا حق ہے، المختصر یہی کہا جاسکتا ہے: اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد مخلوق میں سب سے اعلیٰ واَولیٰ آپؐ ہی کی ذات ہے۔''

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور شمشیر کی مانند تھا؟ فرمایا: نہیں، بلکہ چاند کی طرح حسین وجمیل تھا۔'' (صحیح بخاری: ۳۵۵۲)

انہوں نے چاند سے تشبیہ دی کہ چاند میں چمک دمک بھی ہے اور گولائی بھی۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ سے یہی سوال ہوا تو فرمایا:

’’نہیں! بلکہ آپ کا رخِ انور سورج اور چاند کی طرح روشن، چمکدار اور گولائی لیے ہوئے تھا۔‘‘

(مسلم: ۲۳۴۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’’میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حسین و جمیل کسی اور کو نہیں پایا، یوں معلوم ہوتا کہ آپ کے رُخِ انور میں سورج رواں دواں ہو۔‘‘ (ترمذی: ۳۶۴۸)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

’’میں چرخہ کات رہی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے بیٹھے اپنے جوتے کو پیوند لگا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے، جن سے نور کی شعاعیں نکل رہی تھیں، اس حسین منظر کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حیرت میں دیکھا تو فرمایا: کیوں حیران ہو رہی ہو؟ میں نے کہا: آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ہیں، جن سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور میری پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا: اے عائشہؓ! جس طرح تو نے آج مجھے خوش کیا ہے، اِس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ تجھے خوشیاں عطا فرمائے۔‘‘ (سنن بیہقی: ۱۵۴۲۷)

حضرت جابرؓ بن سمرہ بیان کرتے ہیں:

’’ایک مرتبہ چاندنی رات میں مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا موقع ملا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سرخ پوشاک زیب تن کر رکھی تھی، میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخِ انور پر نظر ڈالتا اور کبھی چاند کی طرف دیکھتا، کافی دیر یہی سلسلہ جاری رہا اور بار بار تجزیے کے بعد بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چودھویں کے چاند سے زیادہ دلربا اور حسین و جمیل ہیں۔‘‘ (ترمذی: ۲۸۱۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جمالِ مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ان محبت بھرے الفاظ میں کیا:

’’نہ کسی ایسے ریشم کو چھونے کا اتفاق ہوا ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی سے زیادہ ملائم ہو اور نہ ہی کوئی ایسی خوشبو سونگھی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے زیادہ معطر ہو۔‘‘ (صحیح بخاری)

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ اقدس برف سے زیادہ خنک اور کستوری سے زیادہ خوشبودار تھا۔‘‘ (صحیح البخاری)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

’’حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس کی طرف روانہ ہوئے، میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں چل دیا۔ راستے میں بچوں نے آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک

ایک کر کے ان کے رخساروں پر دست اقدس پھیرتے جارہے تھے۔ آپ نے میرے رخساروں پر بھی دست اقدس پھیرا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس میں ایسی ٹھنڈک اور خوشبو کو محسوس کیا گویا آپ نے اپنے دست اقدس کو ابھی عطار کے صندوقچے سے نکالا ہو۔‘‘ (صحیح مسلم)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے حسن کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز عشاء میں سورۂ والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے زیادہ اچھی آواز کسی کی نہیں سنی۔‘‘ (صحیح مسلم)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

’’میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخِ انور کی زیارت کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے آپ نے سرمہ لگا رکھا ہے، حالانکہ آپ نے سرمہ استعمال نہیں کیا ہوتا تھا۔‘‘ (جامع الترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’’نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرضِ وصال کے زمانے میں ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرۂ مبارکہ کا پردہ اُٹھایا اور اپنے غلاموں کی طرف دیکھا تو ہمیں یوں محسوس ہوا گویا کہ آپ کا چہرۂ انور قرآن مجید کا ورق ہے۔‘‘ (بخاری: ۶۸۰)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہودیوں کے بڑے عالم تھے، تورات پر عبور حاصل تھا، وہ اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

’’جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو میں آپ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہی آپ کو دیکھنے کے لیے حاضر ہوا، میری نگاہ جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر پڑی تو میں نے جان لیا کہ ایسا دلکش و دلربا چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا۔‘‘ (ترمذی: ۲۴۸۵)

حضرت حارث بن عَمرو سہمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’’میں منیٰ یا عرفات کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جوق در جوق آتے ہوئے دیکھ رہا تھا، میں نے مشاہدہ کیا کہ بدو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخِ انور کی زیارت کرتے تو بے ساختہ پکار اُٹھتے کہ یہ بڑا ہی مبارک چہرہ ہے۔‘‘ (ابوداؤد: ۱۷۴۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جس نے مجھے دیکھا، اُس نے حق کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت کو اختیار نہیں کرسکتا۔‘‘

(بخاری: ۲۵۶۸)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین

# دین خیر خواہی کا نام ہے

مفتی ابوالخیر عارف محمود
گلگت

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

’’أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: الدين النصيحة ، قلنا لمن؟ قال : لِله ولكتابهٖ ولرسولهٖ ولأئمة المسلمين وعامتهم.‘‘

(صحیح مسلم، باب الدین النصیحة :۱/۵۴،ط:قدیمی)

ترجمہ: ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے (یعنی نصیحت اور خیر خواہی اعمالِ دین میں سے افضل ترین عمل ہے یا نصیحت اور خیر خواہی دین کا ایک مہتم بالشان نصب العین ہے) ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کے حق میں کرنی چاہیے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، اللہ کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے ائمہ کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے۔‘‘

**مدارِ اسلام:** یہ حدیث ان احادیث مبارکہ میں سے ہے جن کو مدارِ اسلام قرار دیا گیا ہے۔

**دینِ اسلام:** حدیث میں دین سے مراد دینِ اسلام ہے۔

**النصيحة کا معنی:** نصیحت کا معنی ہے اخلاص، خیر خواہی اور خیر و بھلائی کے کام میں حتی الوسع کوشش کرنا۔

**أئمة المسلمین سے مراد:** ائمہ مسلمین سے مراد علماء کرام، حکام اور اہلِ حل وعقد ہے۔

**عامتهم سے مراد:** عامتهم سے تمام مسلمان مراد ہیں۔

**اللہ تعالیٰ کے لیے نصیحت ہونے کا مطلب:** اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کے ساتھ مخلص ہو، اس کی وحدانیت وصفاتِ کمال کا صدقِ دل سے اس طور پہ اعتراف کرے کہ کسی طرح بھی شرک کا احتمال

باقی نہ رہے۔

ہمہ وقت ظاہری و باطنی طور پر اللہ کی بندگی اختیار کرے، خوشحالی اور تنگ دستی ہر حال میں اس کی طرف رجوع کرے اور توبہ واستغفار کو لازم پکڑے۔

ولکتابہٖ کا مطلب: اس کی کتاب کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ ومعانی کو یاد کرے اور غور وفکر کرے اور دل وجان سے اس کے احکام پہ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔

ولرسولہٖ کا مطلب: اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نبوت کی تصدیق کرے، جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اور اس کی دعوت دی ہے اسے قبول کرے، اوامر ونواہی میں اس کی اطاعت کرے، اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرے، اس کی تعظیم وتوقیر واحترام کے ساتھ اس کی سنت کو زندہ کرے اور اس کی نشر واشاعت وتبلیغ کا اہتمام کرے۔

ولأئمة المسلمین کا معنی ومطلب: ائمہ مسلمین کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور بعد کے حکام کی جائز کاموں میں اطاعت کرنا، ان کی معیت میں کفار سے جہاد کرنا، اسلامی حکومت کے زیرِ انتظام زکوۃ ادا کرنا، جب تک کفر بواح نہ ہو ان کے خلاف خروج وبغاوت نہ کرنا۔

علماء کرام کے لیے نصیحت کا مطلب: علماء کرام کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی طرف سے کی گئی دینی رہنمائی کو قبول کرنا اور ان کا ادب واحترام کرنا۔

وعامتھم کا معنی؛ عامة المسلمین کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے وہی پسند کرے جو خود اپنے لیے پسند ہو، اور جو اپنے لیے ناپسندیدہ ہو تو اسے ان کے لیے بھی ناپسند کرے، اور ان کی اصلاح اور دینی تعلیم تربیت کی فکر کرے، ان کو نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے، ان کے آبرو کی حفاظت کرے، بڑوں کا احترام کرے، چھوٹوں سے شفقت کا معاملہ کرے۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

# قرن اول سے قیاس کی چند مثالیں

مولانا عصمت اللہ نظامانی
متخصص علومِ حدیث، جامعہ

فقہی اُصول اور شرعی دلائل میں ''قیاس'' کی جو اہمیت ہے، وہ کسی مُنصف مزاج شخص سے پوشیدہ نہیں، شریعت کے احکام کی ایک بہت بڑی تعداد قیاس کے ذریعے ہی ثابت ہوتی ہے، اسی لیے عہدِ نبوی سے لے کر عصر حاضر تک جمہور فقہائے کرام اور مستند اہلِ علم ''قیاس'' کرتے آئے ہیں، اور اس کی ضرورت واہمیت کا برملا اعتراف کیا ہے، نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی صحابہ کرامؓ نے قیاس کو ایک بنیادی اصول جانا، اور اس کے ذریعے احکام کو ثابت کیا اور ان پر عمل کیا۔

لیکن قیاس سے مسائل کا استنباط کرنے کے لیے علوم میں رسوخ وپختگی کے ساتھ گہری فقہی بصیرت، استنباطِ مسائل کا ملکہ اور قیاس کے منہج وطریقۂ کار سے آشنائی بھی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بذات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس سلسلے میں تربیت کی، اور انہیں قیاس واجتہاد کے ذریعے مسائل کا حل معلوم کرنے کا طریقہ بتلایا، جس کی وجہ سے صحابہؓ کے اندر قیاس کرنے کا ملکہ وصلاحیت پیدا ہوگئی تھی، اور انہوں نے بیسیوں مسائل کا اس کے ذریعے حل نکالا۔ زیرِنظر مضمون میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فقہی قیاسات پر مختصر نظر ڈالی جائے گی، تاکہ پڑھنے والوں کو ان کے طریقۂ استدلال اور رسول اللہ ﷺ کے اندازِ تربیت سے واقفیت ہو اور مُنکرینِ قیاس پر بھی ضمناً رد ہوجائے، اور ان پر بھی قیاس کی اہمیت آشکارا ہو۔

## نبی کریم ﷺ کا قیاس کے ذریعے مسئلہ سمجھانا

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی تھی، اور اب اس کا انتقال ہوچکا ہے، لہٰذا اب کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لو كان عليها دين أكنت قاضيه؟''، ''اگر اس پر قرض ہوتا تو کیا تم وہ (بہن کی طرف سے) ادا کرتے؟'' اس آدمی نے کہا کہ جی ہاں، میں ادا کرتا، تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''فاقض الله، فهو

أحق بالقضاء.‘‘(۱) یعنی ’’اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو، کیونکہ وہ ادا کیے جانے کے زیادہ حق دار ہے۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے حق اللہ کی قضا کے سلسلے میں حق العباد پر قیاس کر کے مسئلہ سمجھایا، وہ ایسے کہ جس طرح قریبی رشتہ دار کی وفات کے بعد اس پر لازم ایک حق کی ادائیگی کی جاتی ہے تو دوسرے حق یعنی حقوق اللہ کی بھی ادائیگی کرنی چاہیے۔

اس حدیث کے تحت علامہ ابن بطالؒ نے امام مہلبؒ سے نقل کیا ہے:

’’وقوله: (أرأيت لو كان عليها دين) هو تمثيل من النبي (صلي الله عليه وسلم) وتعليم لأمته القياس والاستدلال.‘‘(۲)

ترجمہ: ’’آپ ﷺ کا ارشاد: ’’أرأيت لو كان عليها دين‘‘ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے مثال بیان کرنا ہے اور اپنی امت کو قیاس واستدلال کی تعلیم دینا ہے۔‘‘

## صحابیؓ کے قیاس سے حضور ﷺ کا مسرور ہونا

نبی کریم ﷺ کو حضرت زید بن حارثہ اور ان کے فرزند اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے بہت محبت تھی، خصوصاً اس لیے بھی کہ حضرت زیدؓ بچپن سے آپ ﷺ کے زیرِ کفالت اور ساتھ رہ رہے تھے، اور حضرت اسامہؓ تو عہدِ نبوی میں ’’حِبِ رسول‘‘ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے، یعنی رسول اللہ ﷺ کا محبوب۔ لیکن ان باپ بیٹے کے رنگ میں بہت فرق تھا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا رنگ سیاہ تھا، جبکہ ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رنگ صاف اور گورا تھا، اس لیے جاہلیت میں کچھ لوگ ان کے نسب سے متعلق شک وشبہہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنے وقت کے بہترین قیافہ شناس شخص حضرت مجزز مدلجی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، اس وقت دونوں باپ بیٹے یعنی حضرت زید اور اسامہ رضی اللہ عنہما ایک چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، صرف ان کے پاؤں باہر سے نظر آرہے تھے، انہیں دیکھ کر مجزز مدلجی نے کہا: ’’إن هٰذه الأقدام بعضها من بعض.‘‘ یعنی ’’بیشک یہ پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔‘‘

نبی کریم ﷺ کو اس کی بات سے بہت خوشی ہوئی، کیونکہ اس سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں طعن کرنے والوں کو جواب مل گیا۔ ابوداود شریف کی روایت کے الفاظ ہیں:

’’قالت: دخل علي مسرورًا تبرق أسارير وجهه.‘‘(۳)

’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس خوش ہوکر آئے، اس حال میں آپ کا چہرہ چمک رہا تھا۔‘‘

اس حدیث میں ایک صحابی مجزز مدلجی رضی اللہ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ اور اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں دیکھ کران کے درمیان مشابہت پا کران دونوں کے ایک نسب ہونے کا کہا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پرخوشی کا اظہار کیا۔ اگر چہ یہ قیاس فقہی نہیں ہے، تاہم دو مشابہ چیزوں میں ایک ہی حکم ثابت کیا جارہا تھا، تو اس میں بھی ایک گونا قیاس وعقل کا دخل ہے، جیسا کہ صاحب علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قاس مجزز المدلجيؓ وقاف وحكم بقياسه وقيافته على أن أقدام زيد وأسامة ابنه بعضها من بعض.''(۴)

ترجمہ: ''مجزز مدلجی رضی اللہ عنہ نے قیاس کیا، اور قیافہ شناسی کی، اور اپنے قیاس وقیافہ شناسی کے مطابق حکم لگایا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اوران کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں ایک دوسرے سے ہیں۔''

## حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا قیاس

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ دورانِ سفر غسل کی حاجت ہوئی، مگر ان کے پاس پانی موجود نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے تیمم کیا، لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بوقتِ ضرورت تیمم جب وضو کا قائم مقام ہوتا ہے تو وضو کی ہیئت پر ہوتا ہے کہ چہرے اور دونوں بازوؤں پر مسح کیا جاتا ہے، لہٰذا غسل کے لیے تیمم بھی غسل کی ہیئت وشکل پر ہونا چاہیے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''وأما أنا فتمعكت فصليت، فذكرت للنبي صلي الله عليه وسلم.''(۵)

یعنی ''میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوا، اور نماز پڑھی، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اس کا تذکرہ کیا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عملی طور پر تیمم کر کے دکھایا، اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور پھر ان میں پھونک لگا کر چہرہ کا مسح کیا، اور ہاتھوں (بازوؤں) کا مسح کیا۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے غسل کے تیمم کی ہیئت کو غسل پر قیاس کیا، اور چونکہ یہ قیاس درست نہیں تھا، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صحیح طریقہ بتلایا۔ اس حدیث کے تحت علامہ کرمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وفي قصة عمارؓ جواز الاجتهاد في زمن الرسول صلي الله عليه وسلم.''(۶)

ترجمہ: ''حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجتہاد کے جواز کا ثبوت ہے۔''

## حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا قیاس

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو غزوہ ذات السلاسل میں ایک رات احتلام ہوا، اس رات ٹھنڈ بہت

تھی اور انہیں ڈر رہا کہ اگر پانی استعمال کریں گے تو جان جاسکتی ہے، لہٰذا انہوں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھائی، لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''يا عمرو! صليت بأصحابك وأنت جنب.''

ترجمہ: ''اے عمرو! تم نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھائی، حالانکہ تم جنبی تھے۔''

چنانچہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذر بتایا، جس کی وجہ سے میں نے غسل نہیں کیا تھا، اور میں نے مزید عرض کیا:

''إني سمعت الله يقول: وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا''

''میں نے اللہ تعالیٰ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔''

''فضحك رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يقل شيئًا.''(۷)

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات سن کر مسکرا دیے، اور انہیں کچھ نہیں کہا۔''

اس حدیث سے واضح ہوا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے قیاس کر کے تیمم کیا تھا، کیونکہ قرآن پاک میں ٹھنڈ کی وجہ سے تیمم کرنے کا ذکر نہیں، بلکہ پانی موجود نہ ہونے کی صورت میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے، لیکن حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ پانی کی عدمِ دستیابی کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ ٹھنڈ کا مسئلہ تھا، چنانچہ انہوں اس آیت سے قیاس کر کے مسئلہ مستنبط کیا کہ جس طرح ہتھیار وغیرہ سے اپنے آپ کو قتل کرنا ممنوع ہے، اسی طرح ٹھنڈے پانی سے جان کو خطرہ ہونے کی وجہ اسے استعمال کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا، اس لیے انہوں نے تیمم کیا۔

## حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قیاس

ا: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تین پتھر لانے کا فرمایا، حضرت عبداللہ بن مسعود کو دو پتھر ملے، لیکن تلاش کے باوجود تیسرا پتھر نہیں ملا، چنانچہ وہ تیسرے پتھر کے بجائے لید اُٹھا آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو پتھر لیے، اور لید کو پھینک دیا، اور فرمایا: ''هٰذا ركس''(۸) اور اس سے استنجاء نہیں کیا جاسکتا۔ حضراتِ شارحینؒ نے بیان کیا ہے کہ ''رکس'' کا مطلب ہے نجس چیز، جبکہ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ''رکس'' جنات کے کھانے کو کہتے ہیں۔(۹)

یہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پتھر پر گوبر کے خشک ٹکڑے کو قیاس کیا، کیونکہ جس طرح

پتھر سے نجاست زائل ہوتی ہے، اسی طرح سوکھی لید سے بھی بظاہر نجاست سے صفائی ونظافت حاصل ہوسکتی ہے، اس لیے انہوں نے پتھر پر لید کو قیاس کیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری وجہ سے لید کو استعمال نہیں کیا، کیونکہ وہ خود نجس یا جنات کا کھانا تھی۔

۲: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک عورت کے بارے سوال کیا گیا کہ جس کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا، لیکن اس نے اپنی بیوی کے لیے کوئی مہر مقرر نہیں کیا تھا، اور نہ اس سے ہمبستری کی تھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ اب اس عورت کو مہر میں کیا ملے گا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں بہت غور وفکر کیا، لوگ تقریباً مہینہ بھر اُن کے پاس آتے جاتے رہے، بالآخر ایک دن انہوں نے جواب دیا:

’’فإني أقول فيها: إن لها صداقًا كصداق نسائها لا وكس ولا شطط وإن لها الميراث وعليها العدة، فإن يك صوابًا فمن الله وإن يكن خطأ فمني ومن الشيطان والله ورسوله بريئان.‘‘(۱۰)

ترجمہ: ’’اس بارے میں میری یہ رائے ہے کہ اس عورت کا مہر اس کے خاندان کی عورتوں کے برابر ہوگا، نہ کم ہوگا اور نہ زیادہ، نیز اس کے لیے میراث بھی ہوگی اور وہ عدت بھی گزارے گی۔ پس اگر یہ رائے درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو وہ میری اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس خطا سے بری ہیں۔‘‘

اس مسئلہ میں بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قیاس واجتہاد سے کام لیا، اور مہر لازم ہونے کے سلسلے میں موت کو جماع پر قیاس کیا، وہ ایسے کہ جس طرح جماع کے بعد طلاق ہونے کی صورت میں عدت واجب ہوتی، اور مکمل مہر بھی لازم ہوتا ہے، اسی طرح جماع سے پہلے موت کی صورت میں بھی عدت واجب ہوتی ہے، لہٰذا مہر بھی واجب ہونا چاہیے۔ اور چونکہ مہر مقرر نہیں تھا، اس لیے مہر مثل لازم ہوا۔

## حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قیاس

میراث کے ایک مسئلہ ’’مقاسمۃ الجد‘‘ میں صحابہ کرامؓ میں کچھ اختلاف تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں متوفیٰ شخص کے بہن بھائی وراثت سے محروم ہوں گے یا وراثت پائیں گے؟ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نزدیک انہیں بھی میراث سے حصہ ملے گا، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم دادا کی موجودگی میں میت کے بھائی بہنوں کے میراث سے محروم ہونے کے قائل تھے، چنانچہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اس مسئلہ میں قیاس کا استعمال بھی کرتے تھے، اور فرماتے تھے:

’’ألا يتقي الله زيد، يجعل ابن الابن ابنًا، ولا يجعل أبا الأب أبًا.‘‘(۱۱)

ترجمہ: ’’زید بن ثابت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا نہیں؟ وہ پوتے کو بمنزلہ بیٹا قرار دیتا ہے، لیکن دادا کو باپ کے مرتبہ میں نہیں بناتا۔‘‘

یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بھائی بہنوں کے لیے حاجب بننے میں دادا کو پوتے پر قیاس کرتے تھے کہ جس طرح پوتا حاجب بنتا ہے، جبکہ اس کے اور میت کے درمیان ایک واسطہ (بیٹے کا) ہے، اسی طرح دادا کو بھی حاجب ہونا چاہیے کہ اس کے اور میت کے درمیان بھی ایک واسطہ (والد کا) ہوتا ہے۔

## صحابہؓ کی ایک جماعت کا قیاس کرنا

غزوۂ خندق کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا:

’’لا يصلين أحد العصر إلا في بني قريظة.‘‘(۱۲)

ترجمہ: ’’کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے، مگر بنی قریظہ میں۔‘‘

پھر ہوا یوں کہ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا تو صحابہ کرامؓ دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے، بعض نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ سے پہلے عصر کی نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، لہٰذا انہوں نے راستہ میں عصر کی نماز ادا نہیں کی، جبکہ دیگر صحابہؓ کہنے لگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنو قریظہ میں جلد پہنچو، درمیان میں دوسری چیزوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے، عصر کی نماز سے روکنا، اور بنو قریظہ میں ہی ادا کرنا بذاتِ خود مقصد نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے راستے میں نماز ادا کی۔ چنانچہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھی نہیں ڈانٹا۔ اس واقعہ میں دوسری جماعت نے قیاس واجتہاد سے کام لیا کہ جس طرح صلوٰۃ الخوف میں سواری پر نماز پڑھی جاسکتی ہے، اسی طرح یہاں بھی راستہ میں سواری پر نماز پڑھنا ممکن ہے، اس طرح نماز بھی بروقت ادا ہوگئی اور بنو قریظہ کی طرف جلد پہنچنے کے حکم پر بھی عمل ہوگیا۔

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

’’ففيه دلالة لمن يقول بالمفهوم والقياس.‘‘(۱۳)

’’اس حدیث میں اس شخص کے لیے دلیل ہے جو مفہوم اور قیاس (سے استدلال) کا قائل ہے۔‘‘

## خلاصۂ کلام

اسی طرح اور بھی بیسیوں مسائل ہیں جن میں جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کیا اور قیاس پر عمل کیا، جس سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ ’’قیاس‘‘ بھی اصولِ شرع میں سے ایک اہم اصل ہے،

بالخصوص جبکہ نبی کریم ﷺ نے بھی بسا اوقات قیاس کے ذریعے سائل کو مسئلہ سمجھایا، لہٰذا اس میں دورِ حاضر کے ان متشدد حضرات کے لیے بھی درس ہے جو علی الاطلاق قیاس کو ممنوع قرار دیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ائمہ کرام پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔

## حواشی وحوالہ جات


١-صحيح البخاري، (١٤٢/ ٨)، كتاب الأيمان، باب من مات وعليه نذر، رقم الحديث: ٦٦٩٩

٢-شرح صحيح البخاري لابن بطال، (١٦٢/ ٦)، الناشر: مكتبة الرشد، الرياض

٣-سنن أبي داود، (٢٤٨/ ٢)، كتاب الطلاق، باب في القافة، رقم الحديث: ٢٢٧٠

٤-إعلام الموقعين لابن القيم، (٢٠٤/ ١)، الناشر: دار الجيل، بيروت

٥-صحيح البخاري، (٧٥/ ١)، كتاب التيمم، باب: المتيمم هل ينفخ فيهما، رقم الحديث: ٣٣٨

٦-الكوكب الدراري للكرماني، (٢١٩/ ٣)، الناشر: دار إحياء التراث العربي، بيروت

٧- سنن أبي داود، (١٣٢/ ١)، كتاب الطهارة، باب إذا الجنب البرد، رقم الحديث: ٣٣٤

٨- صحيح البخاري، (٤٣/ ١)، كتاب الوضوء، باب: لايستنجي بروث، رقم الحديث: ١٥٦

٩-سنن النسائي، (٤٢/ ١)، الناشر: دار المعرفة، بيروت

١٠-سنن أبي داود، (٢٠٢/ ٢)، كتاب النكاح، باب فيمن تزوج ولم يسم صداقاً حتى مات، رقم الحديث: ٢١١٨

١١-شرح صحيح البخاري لابن بطال، (٣٦٢/ ١٠)، الناشر: مكتبة الرشد، الرياض

١٢-صحيح البخاري، (١٥/ ٢)، باب صلاة الطالب والمطلوب راكباً وإيماء، رقم الحديث: ٩٤٦

١٣-شرح مسلم للنووي، (٩٨/ ١٢)، الناشر:دار إحياء التراث العربي، بيروت


..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

# حق مہر کی شرعی حقیقت اور رائج تصورات کا جائزہ

مولانا سید انور شاہ
جامعہ بیت السلام، کراچی

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جیسے خوراک، لباس اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خاندان بھی اس کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے، خاندان کے بغیر زندگی قیدِ تنہائی سے کم نہیں، انسان کو زندگی کے تقریباً ہر اہم مرحلے میں خاندان کے تعاون اور رفاقت کی ضرورت پیش آتی ہے، خوشی ہو یا غمی دونوں کا حقیقی اندازہ اور اثر خاندان کی شرکت ہی سے مکمل ہوتا ہے۔ اگر خاندان کی دلجوئی اور ہمدردی شامل حال نہ ہو تو معمولی غم بھی نا قابلِ برداشت محسوس ہونے لگتا ہے، اسی لیے اسلام میں خاندانی نظام کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو اپنے انعامات میں شمار فرمایا ہے: ''اِنَّا جَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ '' (اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے) ہر شادی شدہ شخص کے ساتھ خاندان کی تین شاخیں وجود میں آتی ہیں، ددھیال، ننھیال، اور سسرال۔ یہ تینوں رشتے نکاح ہی کے ذریعے قائم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اسلام میں نکاح کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ نکاح مرد اور عورت کے درمیان انجام پانے والا قابلِ احترام عقد ہے، جس سے عائلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، نکاح کے ذریعے دو اجنبی مرد و عورت ایک مودت و محبت اور اعتماد کی فضا میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں، اسلام رشتۂ نکاح کو پائیدار اور مستحکم دیکھنا چاہتا ہے، اسی لیے اس نے نکاح کے سلسلے میں ایسے احکام اور ہدایات دی ہیں، جن کے نتیجے میں دونوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہو جاتا ہے۔

انہی احکام میں سے ایک اہم حکم حقِ مہر ہے۔ مہر کے معاملے میں لوگ افراط و تفریط اور مختلف غلطیوں کا شکار ہیں، خاص کر یہ تأثر تو بہت زیادہ عام ہے کہ مہر جتنا کم سے کم طے کیا جائے، شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، جن کی اصلاح نہایت ضروری ہے، لہٰذا اس تحریر میں ان غلطیوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے، تاکہ قارئین

ان سے آگاہ ہوکر درست طرزِ عمل اختیار کریں۔

## حق مہر کی حقیقت

مہر دراصل شوہر کی طرف سے عورت کا ایک اعزاز و اکرام ہے، یہ نہ تو عورت کی قیمت ہے، جسے ادا کرکے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بک گئی ہے، اور اب اس کی حیثیت محض ایک لونڈی کی ہے اور نہ یہ محض ایک فرضی اور رسمی کارروائی ہے، جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شرعی نقطہ نظر سے شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر لازم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے، اور اسے ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز و اکرام کے مناسب ہو، اس لیے شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی مقدار نہ تو اتنی کم رکھی جائے، جس میں اعزاز و اکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو جائے اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہو، اور بالآخر یا تو مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

## مہر کے تمام پہلو واضح ہونے چاہئیں

مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کارروائی نہیں ہے، جو غور و فکر اور سوچے سمجھے بغیر کر لی جائے، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی اور بیداری کا محتاج ہے، شرعاً اس کے تمام پہلو واضح اور صاف ہونے چاہئیں اور اس کے مطابق ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے۔

یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر بے فکر رہنے کے بعد بسترِ مرگ پر بیوی سے اس کی معافی حاصل کر لی جائے، جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

## عورت کا حق مہر کتنا ہونا چاہیے؟

شرعی نقطہ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے ''مہر مثل'' دیا جائے، مہر مثل کا مطلب: لڑکی کے باپ کے خاندان کی وہ لڑکیاں جو مال، جمال، دین، عمر، عقل، شہر، باکرہ یا ثیبہ ہونے میں اس کے برابر ہوں، ان کا جتنا مہر تھا، اتنا مہر، مہر مثل ہے۔ خاندان کی لڑکیوں سے مراد اس کی بہنیں، پھوپھی زاد، چچا زاد بہنیں وغیرہ ہیں اور اگر اس لڑکی کے خاندان میں دوسری لڑکیاں نہ ہوں تو خاندان کے باہر اس کی ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو، وہ اس لڑکی کا مہر مثل ہے، اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حقدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بخود لازم ہو جاتا ہے، اور شوہر کے ذمہ شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ

وہ بیوی کو اس کا مہر مثل ادا کرے۔ البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہوجائے یا شوہر خوشی سے مہر مثل سے زیادہ مہر کی مقدار طے کرلے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مقرر کرلینا جائز ہے، شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے، البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کردی ہے۔

## اقل مہر کی مقدار

مہر کی کم از کم مقدار حنفی مذہب کے مطابق دس درہم ہے۔ دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے، موجودہ اوزان کے اعتبار سے اس کی مقدار ۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام چاندی ہے، چاندی کی قیمت اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے، آج کل ایک تولہ چاندی کی قیمت تقریباً چھ ہزار (۶۰۰۰) روپے ہے، اس حساب سے کم از کم مہر کی مقدار ۱۵۷۵۶ روپے بنے گی۔ اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر عورت خود بھی راضی ہوجائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد، یعنی عورت کا اعزاز واکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم از کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کرکے رکھی گئی ہے، جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں، اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لیے یہ گنجائش دی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب لینا ہرگز درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی یا اس کی قیمت طے کی جائے۔

## معمولی مقدار میں مہر طے کرنا

لوگوں میں یہ تصور بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم سے کم معمولی مقدار میں مقرر کیا جائے اتنا ہی شریعت کی نظر میں مستحسن اور افضل ہے، اچھے خاصے دیندار لوگ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، حالانکہ یہ تصور غلط اور بے بنیاد ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم مقرر کیا تھا، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ موجودہ حساب کے اعتبار سے اس کی مقدار ۱.۵۳۰۹ کلوگرام چاندی ہے، چاندی کی قیمت اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے، آج کل ایک تولہ چاندی کی قیمت تقریباً چھ ہزار (۶۰۰۰) روپے ہے، اس لحاظ سے مہر فاطمی کی مقدار پاکستانی ۷۸۷۱۰۱ روپے بنے گی۔ خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر کیا، جو اوسط درجے کے اعتبار سے ایک قابلِ لحاظ مہر ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ

تقریر کے دوران لوگوں سے فرمایا کہ: وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں۔ اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قرآن کریم نے ایک جگہ مہر کے لیے ''قنطار'' (سونے چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر مہر ہوسکتا ہے، لہٰذا آپ کا زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاتون کی بات سن کر فرمایا: واقعی خاتون کا استدلال اور بات ٹھیک ہے، اور کلی طور پر زیادہ مہر رکھنے سے منع کرنا درست نہیں۔ (السنن الکبری للإمام البیهقي، کتاب الصداق، ۲۳۳/ ۷) مطلب یہی تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی ہو تو زیادہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ یہاں یہ اصول مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز و اکرام بھی ہو اور شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو، جن حضرات نے زیادہ مہر باندھنے سے منع فرمایا، ان کا مقصد یہی تھا کہ اگر استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کارروائی ہو کر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی، اور مہر ادا نہ کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پر رہ جاتا ہے۔ دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے نام ونمود اور دکھاوے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے، لوگ محض اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لیے غیر معمولی مہر مقرر کرلیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ دونوں باتیں اسلام کے پاکیزہ اور مقدس مزاج کے متصادم ہیں، اس لیے متعدد علمائے کرام نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

## مہر فاطمی بہتر ہے یا شوہر کی حیثیت کا لحاظ کرنا

بعض حضرات مہر فاطمی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی غلط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر طے کرلیں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہے اور اتباعِ سنت کے اجر کا بھی قصد ہو، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں شرعی ہے کہ اس سے زیادہ یا کم مہر مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعی نقطہ نظر سے کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں! یہ اصول مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز واکرام بھی ہو اور شوہر کے گنجائش سے باہر بھی نہ ہو۔

## مہرِ معجّل اور موٴجل کے متعلق غلط فہمی

مہر کی مشہور دو قسمیں ہیں: ۱- مہر معجّل، ۲- مہر موٴجل۔ یہ الفاظ عقدِ نکاح کے موقع پر سنائی دیتے

ہیں، لیکن بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا۔ شرعی اعتبار سے ''مہر معجّل'' اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمہ لازم ہوجاتا ہے، اب اس کا فریضہ یہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی ادا کردے یا اس کے بعد جتنا جلدی ممکن ہو، عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہے اس کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لیے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی ادائیگی ہمارے ذمہ ضروری نہیں، بلکہ شوہر کے ذمہ لازم ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر جس قدر جلد ممکن ہو اس فریضہ سے سبکدوش ہوجائے۔

''مہرِ مؤجل'' اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے فریقین نے آئندہ کوئی تاریخ متعین کی ہو، مثلاً دو سال بعد شوہر مہر ادا کرے گا، وغیرہ۔ مہرِ مؤجل کا مطالبہ عورت مقررہ میعاد سے پہلے کرنے کی مجاز نہیں، لہٰذا مہر کے مؤجل ہونے کا اصل مطلب یہ ہے کہ اس ادائیگی کے لیے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کرلی جائے، لیکن ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الادا ہوگی جب نکاح ختم ہوگا، چنانچہ اگر طلاق ہوجائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی، یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہوجائے، تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

## نام ونمود اور دکھاوے کے لیے زیادہ مہر مقرر کرنا

فخر ومباہات، نام ونمود اور دکھاوے کے لیے زیادہ مہر مقرر کرنا غلط ہے۔ اس سلسلے میں ایک کوتاہی لڑکی کے والدین اور اس کے عزیز واقارب کی جانب سے یہ ہوتی ہے کہ مہر مقرر کرتے وقت لڑکے کی حیثیت اور استطاعت کا لحاظ نہیں کرتے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مہر طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ بعض اوقات اس سلسلے میں شور شرابا اور جھگڑے کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر بعض مرتبہ اسی جھگڑے میں نکاح اور شادی رک جاتی ہے، لوگ زیادہ مہر مقرر کرنے کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں، لیکن غیر معمولی مہر مقرر کرکے اس کو فخر کی چیز سمجھنا، اس پر جھگڑے کھڑے کرنا اور باہمی رنجش کی بنیاد بنا لینا جاہلیت کے جراثیم ہیں، جن سے مسلمانوں کو بچنا چاہیے۔

## سوا بتیس روپے مہر

ایک کوتاہی بعض حلقوں میں یہ رائج ہے کہ وہ سوا بتیس روپے کو مہرِ شرعی سمجھتے ہیں، اس کو مہرِ محمدی بھی کہتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔ خدا جانے یہ غلطی کہاں سے چلی ہے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا: مہر کی کم از کم مقدار دس درہم یعنی دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے۔ اس سے کم مہر مقرر کرنا درست نہیں ہوتا۔

## پہلے بیٹے کے لحاظ سے مہر طے کرنا

بعض لوگوں میں یہ غلطی پائی جاتی ہے کہ وہ مہر کے تعین میں پہلے بیٹے کا لحاظ کرتے ہیں۔ پہلے بیٹے کی بیوی کے لیے جتنا مہر مقرر کیا ہوتا ہے، اسی مقدار کو دوسرے بیٹے کی بیوی کے لیے بھی طے کرتے ہیں اور اس پر باقاعدہ اصرار کرتے ہیں، حالانکہ شرعاً مہر کے تعین میں پہلے بیٹے کی بیوی کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ عورت کے اپنے خاندان کی ہم پلہ خواتین کا اعتبار کیا جاتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

## مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہو

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مہر ادا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ رواج بنتا جارہا ہے کہ لوگ زیادہ مہر مقرر کرلیتے ہیں اور ان کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ مہر دینا نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ایسے لوگوں کے متعلق بہت سخت وعید آئی ہے۔ حدیث پاک کے مطابق جو شخص نکاح کرے اور مہر ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو، وہ زانی ہے۔ (مسند احمد، ج:۴، ص:۳۳۲، طبع: بیروت)

## شرماشرمی میں مہر معاف کرنا

ہمارے معاشرے میں ایک کوتاہی یہ پائی جاتی ہے کہ عورتوں کے لیے مہر لینا معیوب اور برا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح میراث کا حصہ لینا بھی عیب سمجھا جاتا ہے، اس لیے خاتون شرماشرمی میں اور ماحول کے جبر سے معاف کردینا ضروری سمجھتی ہیں۔ اگر تو نہ کریں تو معاشرے میں ''نکو'' سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس معاشرتی برائی کو بالکلیہ ختم کریں اور خواتین کو مہر اور میراث کا حصہ دلوائیں۔ اگر وہ معاف کرنا چاہیں تو ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا حق وصول کرلیں اور کچھ عرصہ اپنے تصرف میں رکھنے کے بعد اگر چاہیں تو مرضی وخوشی اور رضامندی سے واپس لوٹا دیں۔ اس سلسلے میں ان پر ہرگز جبر نہ کیا جائے۔

## ڈرادھمکا کر زبردستی مہر معاف کروانا

اگر شوہر یا اس کے علاوہ کسی نے عورت کو ڈرادھمکا کر مہر معاف کروایا تو مہر معاف نہ ہوگا، بلکہ شوہر کے ذمہ بدستور واجب ہوگا۔ (رد المحتار، کتاب النکاح، ج:۱، ص:۳۱۳، ط: سعید)

## انسدادِ مفاسد کے لیے مہر کی تحدید کرنا

لوگوں پر مہر کی ایک متعین مقدار مقرر کرکے لازم کرنا، تاکہ بعض برادریوں اور قبائل کی مہر کے بارے میں جو افراط وتفریط پائی جاتی ہے، اس کا سدِباب اور خاتمہ ہوجائے، جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مہر کی

ادنیٰ مقدار تو شریعت میں موجود ہے، لیکن زیادہ کی کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی ہے، لہٰذا حاکم وقت، کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ برادریوں کے لیے یا قبائل وغیرہ کے لیے مہر کی کوئی خاص مقدار مقرر کر کے ان پر لازم کر دے کہ اس میں کمی و اضافہ کی اجازت ہی نہ رہے اور ہر شخص اس مقدار پر مجبور ہو جائے، کیونکہ مہر بیوی کا حق ہے، دیگر لوگ اس کے مقرر کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ البتہ دیگر لوگ مناسب مہر مقرر کرنے کی اپیل کر سکتے ہیں۔

## طلاق کی صورت میں مہر کے اضافے کی شرط

طلاق ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور ساتھ ہی بعض ناگزیر حالات میں ایک ضرورت بھی ہے، لیکن اس کے غلط اور بے جا استعمال سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، جس سے مرد و عورت اور سارا خاندان متأثر ہوتا ہے، لہٰذا طلاق کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے اگر عقدِ نکاح کے وقت یوں مہر طے کیا جائے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی تو عورت کا مہر دو لاکھ روپے ہے اور اگر اس نے طلاق نہ دی تو پھر عورت کا مہر ایک لاکھ روپے ہے، اس طرح مہر طے کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شوہر مہر کی بڑی رقم سے بچنے کے لیے ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا غیر مشروع اقدام نہ کرے، آیا اس طرح مہر طے کرنا جائز اور معتبر ہے یا نہیں؟

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے فقہ کی اس مشہور مسئلہ سے رہنمائی لی جا سکتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت اس طرح مہر طے ہو کہ شوہر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر نہیں لے گیا تو مہر ایک ہزار ہوگا اور اگر بیوی کو اس کے آبائی وطن سے باہر لے گیا تو اس کا مہر دو ہزار ہوگا۔ اس مسئلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جس مہر کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اسی کا اعتبار کیا جائے گا اور پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر یعنی مہرِ مسمیٰ لازم ہوگا، اور دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں ذکر کردہ مہر کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ مہرِ مثل لازم ہوگا، اس شرط کے ساتھ کہ مہرِ مثل مہرِ مسمی سے زائد نہ ہو۔ حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک دونوں شرطیں درست ہیں اور ہر دو صورت میں متعین کردہ مہر یعنی مہرِ مسمی لازم ہوگا۔

موجودہ زمانے میں جبکہ کثرتِ طلاق کی وباء عام ہوتی جا رہی ہے، عوام الناس معمولی معمولی باتوں پر بلاخوف و خطر طلاق دیتے ہیں، جو ایک تشویشناک امر ہے اور وقوعِ طلاق کے نتیجے میں پورے معاشرے میں تباہی و بربادی آتی ہے، جس کے بے حد نقصانات ہیں، مثلاً: زوجین اور ان کے رشتہ داروں کے درمیان عداوت، دشمنی، کینہ، اور بغض و حسد پیدا ہو جاتا ہے، انسان کا بسا بسایا گھر اُجڑ جاتا ہے، بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں، ان کی پرورش و پرداخت اچھی اور نشوونما عمدہ نہیں ہو پاتی، طرفین کا سکون ختم ہو جاتا

ہے، قرآن وسنت کی خلاف ورزی لازم آجاتی ہے، حتیٰ کہ بسااوقات یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوجاتے ہیں، لہٰذا طلاق کی بے جا اور غلط استعمال کو روکنے اور کثرتِ طلاق پر بند باندھنے کے لیے صاحبینؒ کے قول پر عمل کی گنجائش نکل سکتی ہے، خاص کر جب کہ مہر کی یہ جہالت مفضی الی النزاع بھی نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

''و لو تزوجها على ألف إن أقام بها، و على ألفين إن أخرجها، فإن أقام بها فلها الألف، و إن أخرجها فلها مهر المثل، لا يزاد على ألفين و لا ينقص عن الألف، و هذا عند أبي حنيفةؒ، و قالا: الشرطان جميعًا جائزان، حتى كان لها الألف إن أقام بها، و الألفان إن أخرجها.''

(ہدایہ، ج:۲،ص:۵۰۴، ط: البشریٰ، سن الطباعۃ: ۱۴۳۶ھ)

## دوسری عورت سے نکاح کی صورت میں مہر کی زیادتی کی شرط

اگر عقدِ نکاح کے وقت اس طرح مہر مقرر کیا جائے کہ اگر شوہر نے اس منکوحہ کے عقدِ نکاح میں ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کیا تو اس عورت کا مہر دولاکھ روپے ہوگا اور اگر اس عورت کے عقدِ نکاح میں رہتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا تو اس کا مہر ایک لاکھ روپے ہوگا، تو جیسا کہ ماقبل میں تفصیل ذکر کی جاچکی ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پہلی شرط پائی جانے کی صورت میں متعین کردہ مہر یعنی مہرِ مسمی لازم ہوگا اور دوسری شرط پائی جانے کی صورت میں مہرِ مثل لازم ہوگا اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک دونوں شرطیں معتبر ہوں گی اور ہر دوصورتوں میں مہرِ مسمی لازم ہوگا۔

## عورت کے لیے نکاح میں ملازمت کی شرط لگانا

دورِ حاضر میں جہاں مردوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا رواج عروج پر ہے، وہیں ہمارے مسلم معاشرہ کی عورتوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رواج کافی عام ہوتا جارہا ہے، چنانچہ تعلیم کے بعد بہت سی عورتیں مختلف ملازمتوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں، یا وابستہ ہونے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، اور چونکہ موجودہ دور کے مسلم دنیا کے اکثر حکمران مغربی نظریات وافکار سے مرعوب زدہ ہیں، ان کے آزادیِ نسواں کے خوشنما نعروں سے متأثر ہیں، اس لیے وہ بھی عورتوں کی ملازمت پر خاص توجہ اور دھیان دیتی ہے، اس سلسلے میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتی ہے اور اسے گھر سے باہر نکال کر ملازمت سے وابستہ اور جوڑتی ہے، اس پس منظر میں اگر ایسی عورتیں نکاح کے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے یہ شرط لگاتی ہیں کہ شوہر انہیں لگی ہوئی ملازمت سے یا آئندہ ملنے والی ملازمت سے نہیں روکے گا اور شوہر عقدِ نکاح کے وقت اس شرط کو قبول کرتا ہے تو اس

شرط کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ شوہر کے لیے اس شرط کی پابندی ضروری ہوگی یا نہیں؟ اور اگر شوہر اس شرط کو قبول کرنے کے باوجود عورت کو ملازمت چھوڑنے کا حکم دیتا ہے یا نئی ملازمت کرنے سے منع کرتا ہے تو عورت کے لیے شوہر کے اس حکم کی تعمیل ضروری ہوگی یا نہیں؟

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ خاندانی زندگی کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسبِ معاش، خاندان کی کفالت اور گھر سے باہر ذمہ داریوں کی تکمیل مرد کے ذمہ ہے، جبکہ بچوں کی پرورش و تربیت، شوہر کی خدمت اور گھریلو نظم و نسق سنبھالنے کی ذمہ داری عورت کی ہے، جیسا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کی تقسیم یوں فرمائی کہ گھریلو جو امور ہیں، ان کو انجام دینے کی ذمہ داری حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ڈالی اور گھر کے باہر کے جو امور ہیں ان کی خدمت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔

قرآنِ مجید میں اندرونِ خانہ کی ذمہ داریاں، بچوں کی پرورش، شوہر کے مال کی نگہداشت اور گھر کے ماحول کو سنوارنے کی ذمہ داری عورت پر ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے:

''وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'' ترجمہ: ''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔''

''فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ'': ترجمہ: ''نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے اس کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ کام جس کی انجام دہی کے لیے عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر جانا پڑے اور عورت کے باہر کے کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے شوہر کا حق متأثر ہوتا ہو یا اسے ضرر لاحق ہو تو شوہر کو ایسے کاموں سے اپنی بیوی کو روکنے کا حق حاصل ہے۔

غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ شریعت نے حقوقِ زوج کا کتنا خیال رکھا ہے، اگر بیوی ملازمت کے لیے نکلے گی تو یقینی بات ہے کہ پورے دن تھکی ماندی رہے گی، جب شام میں گھر آئے گی تو اپنے آرام و سکون کی فکر میں رہے گی، شوہر کا کیا خیال رکھے گی؟ بچے کی بھی صحیح تربیت نہیں کر سکے گی، گھر کا نظام بھی درست نہ رکھ سکے گی، جو عورت کا اہم فریضہ ہے۔ فقہائے کرام نے جو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر عورت علمی مجلس میں جانا چاہتی ہے اور شوہر اس کو وہاں جانے سے منع کرے تو عورت کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس کی اجازت کے بغیر وہاں چلی جائے۔ (خانية على هامش الهندية: ۱/۴۴۳)

دوسری بات یہ ہے کہ جب شوہر کے ذمہ بیوی کا نان ونفقہ شرعاً واجب ہے تو بیوی کو ملازمت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خاص کر آج کل کے پرفتن دور میں جہاں ہر چار جانب فحاشی، عریانی،

بے حیائی اور بے پردگی عام ہے اور عام طور پر ملازمت دینے والے اداروں میں بے پردگی، مردوں سے اختلاط و آزادی اور غیر محرم سے بلاحجاب بے تکلفی کے ساتھ بات کرنا عام معمول کی بات ہے، دوسری طرف مغرب کی تقلید میں عورت کی ملازمت اور بے جا حقوق کی بات کی جارہی ہے تو ایسے میں شوہر پر ضروری ہے کہ فتنہ کی وجہ سے عورت کو ملازمت کی اجازت ہی نہ دے۔ عورت چراغِ خانہ ہے، شمع محفل نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ شوہر کو شرط قبول کرنے کے باوجود ملازمت ختم کرنے کا حکم دینے یا نئی ملازمت سے روکنے کا اختیار باقی رہے گا اور اس سلسلے میں شوہر کے حکم کی تعمیل ضروری ہوگی، یہ شرط فاسد اور لغو ہو جائے گی، شوہر پر اس کا ایفا لازم نہیں ہوگا۔

البتہ اگر کسی ایسے اسکول میں ملازمت ہو جہاں سارا نظام عورتوں کے ہاتھ میں ہو یا کوئی مدرسۃ البنات ہو جہاں مردوں کے داخلہ پر پابندی ہو اور آنے جانے میں بے پردگی کے فتنے سے بچاؤ کا اہتمام ہو اور شوہر بھی مکمل مطمئن ہو تو ایسی صورت میں شوہر کو اجازت دینی چاہیے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

## یادِ رفتگان

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی ناظم اعلیٰ

# حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھریؒ

محمد اعجاز مصطفیٰ

مجاہدِ ملّت حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے فرزند ارجمند، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے تلمیذ رشید، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ کے مسترشد، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے خلیفہ مجاز، جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے قدیم فاضل اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی ناظم اعلیٰ، مفکرِ ختم نبوت حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری رحمۃ اللہ علیہ ۱۴؍صفر المظفر ۱۴۴۸ھ مطابق ۲۹؍جولائی ۲۰۲۶ء بروز بدھ بوقت شام، نشتر ہسپتال ملتان میں ۹۴؍سال کی طویل عمر گزار کر رحلت فرمائے عالمِ آخرت ہوئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، إن للہ ما أخذ ولہ ما أعطیٰ وکل شيء عندہٗ بأجل مسمّٰی!

آپؒ ۱۹۳۲ء میں متحدہ ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب کے زرخیز خطہ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق آرائیں قوم سے تھا، آباء اجداد کا پیشہ زراعت تھا۔ آپؒ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ امام العصر حضرت علامہ انور کشمیریؒ کے ممتاز شاگرد تھے۔ مجلس احرارِ اسلام کے سرگرم رہنما اور امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے قدیم رفقاء میں سے تھے۔ آپؒ نے پاکستان میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی بنیاد رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور اس کے بانی ارکین میں شامل تھے۔ مجلس کے پہلے ناظم اعلیٰ اور تیسرے امیر مرکزیہ رہے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھریؒ نے حفظِ قرآن کریم مجدّدِ علم قراءات حضرت قاری رحیم بخش پانی پتیؒ سے کیا، ہجرت کے بعد پاکستان میں حضرت قاری صاحب کی سب سے پہلی درس گاہ میں آپ شامل تھے۔ اس کے بعد درجہ کتب کی ابتدائی تعلیم جامعہ خیر المدارس ملتان میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صدیقؒ اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ دورہ حدیث شریف کے لیے آپ کراچی تشریف لائے اور ۱۹۵۷ء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن سے فاتحۂ فراغ پڑھا۔ جہاں آپ کے اساتذہ کرام میں محدّث العصر حضرت علامہ سیّد محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ جیسے جبال العلم شامل تھے۔ اس کے بعد آپؒ نے مختلف مدارس میں تقریباً ۱۳ سال تدریس کی، جن میں مخزن العلوم خان پور بھی شامل ہے، جہاں ہدایہ اولین، سراجی، مرقاۃ اور دیگر علوم وفنون کی کتب زیرِ تدریس رہیں، لیکن پھر آپؒ اپنے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کے ضعف کے باعث اور ان کی جماعتی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے معاون کے طور پر مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر مرکزیہ ملتان تشریف لے آئے اور یہاں آپؒ نے اپنے والد صاحب کے زیرِ تربیت رہ کر جماعتی کام کا طریقہ وسلیقہ سیکھا، جس نے آپؒ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

آپؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت سائیں حماد اللہ ہالیجویؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ سے مختلف اوقات میں اصلاحی تعلق قائم کیا۔ حضرت لدھیانوی شہیدؒ نے آپ کو خلافت واجازتِ بیعت عطا کی۔

آپ ۱۹۷۰ء میں مجلس تحفظ ختم نبوت سے باقاعدہ وابستہ ہوئے۔ ابتدا میں مرکزی خازن اور ناظمِ دفتر مرکزیہ ملتان کے مناصب پر کام کیا اور مجلس کے بے مثال مالی نظام کو مزید مستحکم کیا۔ مجلس کے مالی نظام میں حد درجہ احتیاط، مکمل جانچ پڑتال اور کڑی نگرانی کرنا آپ کی پہچان تھی۔

جب تک صحت نے اجازت دی، آپؒ ملک بھر کے تبلیغی دورے فرماتے اور عقیدہ ختم نبوت اور ردّ قادیانیت پر بیان فرماتے رہے۔ مبلغین ختم نبوت کی سرپرستی اور ان کے تبلیغی کام کی نگرانی فرماتے، لاکھوں کی تعداد میں لٹریچر مرتب کر کے شائع کروایا۔ شہروں اور قصبات میں نئے جماعتی دفاتر قائم فرمائے، پرانے دفاتر میں نظام کی اصلاح کی۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰنؒ ۱۹۸۵ء میں مجلس کے مرکزی ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور اس عہدے پر ۱۴ سال فائز رہے۔ سچ ہے کہ آپؒ نے اپنی دیانت داری، معاملات کی صفائی اور بیدار مغزی وغیرہ صفات سے اس وقیع عہدے کو بلند تر بنا دیا تھا۔ اکابرینِ مجلس حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، حضرت مولانا لال

حسین اخترؒ، حضرت مولانا محمد حیاتؒ، حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ، حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ اور حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی دامت برکاتہم کے زیرِسایہ ۵۶ سالہ بھرپور جماعتی زندگی گزاری۔

آپؒ چند سالوں سے بیمار تھے، ضعف وعوارض بھی لاحق تھے، چند سال قبل اہلیہ اور ایک بیٹے کی وفات سے طبیعت متاثر تھی، لیکن آخری وقت تک باقاعدگی سے دفتر تشریف لاتے رہے اور جماعتی کاموں کی نگرانی وسرپرستی فرماتے رہے۔ انتقال سے قبل نشتر ہسپتال ملتان میں زیرِ علاج رہے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔ پسماندگان میں تین صاحب زادے ہیں۔

آپ کی نمازِ جنازہ اگلے روز ۱۵؍صفر المظفر ۱۴۴۸ھ مطابق ۳۰؍جولائی بروز جمعرات شام ۶؍ بجے قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر مرکزیہ حضرت مولانا حافظ ناصر الدین خاکوانی دامت برکاتہم نے پڑھائی۔ جنازے سے قبل وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے جنرل سیکریٹری مولانا قاری محمد حنیف جالندھری دامت برکاتہم اور دیگر علمائے کرام نے خطاب کیا۔ ملک کے طول وعرض سے ہزاروں مسلمانوں، سیکڑوں کارکنانِ ختم نبوت، مبلغین، علمائے کرام اور مختلف جماعتوں کے قائدین نے جنازے میں شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے، آپؒ کے لواحقین اور عالمی مجلس کے تمام وابستگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کامیاب وکامران فرمائے، آمین!

## حضرت مولانا محمد طیب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے قدیم فاضل، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے متخصص، حضرت بنوریؒ سے فیض یافتہ، حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ کے شاگردِ رشید، شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے ماہنامہ بینات کے امور میں معاون، جامع مسجد سبیل والی کے امام وخطیب حضرت مولانا محمد طیب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس دنیائے رنگ وبو میں ۹۷؍سال رہ کر ۱۱؍ذوالحجہ ۱۴۴۷ھ مطابق ۲۸؍مئی ۲۰۲۶ء بروز جمعرات عالَم عقبیٰ کو سدھار گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، إن للہ ما أخذ ولہ ما أعطیٰ وکل شيء عندہٗ بأجل مسمّٰی!

مولانا طیب بن سکندر خان آزاد کشمیر کے گاؤں غنی آباد باندیاں میں ۰۳-۱۲-۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے چچا محترم مولانا امیر الزمان صاحب فاضل دار العلوم دیوبند کا آپ کی تعلیم اور تربیت میں کلیدی کردار رہا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی، پھر وسطانی درجات کی دینی تعلیم کے حصول کے لیے آزاد کشمیر کی معروف دینی درسگاہ دار العلوم پلندری میں داخلہ لیا، یہاں ابتدائی چار درجات پڑھنے کے بعد آپ پنجاب کی معروف دینی درسگاہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ تشریف لے گئے اور ۱۹۶۹ء میں وہاں سے دورۂ حدیث مکمل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی تشریف لے آئے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں دو سالہ تخصص فی الدعوۃ والارشاد مکمل کیا۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۰ء تک جامعہ کے رسالے ماہنامہ بینات میں حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے ساتھ بطور معاون کام کیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۲۰۲۴ء تک گرومندر چورنگی پر واقع سبیل والی مسجد میں ۵۴ سال امامت وخطابت کی ذمہ داری نبھائی، مشہور تھا کہ آپ نماز باجماعت میں کبھی تاخیر نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ وقت پر جماعت کھڑی کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔

آپ کے مشہور اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یوسف خاں پلندری، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ آپ چار سال آزاد کشمیر جمعیت علماء اسلام کے مرکزی امیر رہے اور ۴؍ سال اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر رہے۔

مولانا باغ و بہار شخصیت تھے۔ آپ کی مجلس میں بیٹھنے والا ہر فرد ایسا گرویدہ بن جاتا کہ وہ مجلس کبھی بھول نہ پاتا۔ چٹکلوں، لطیفوں اور برمحل اور برموقع جملوں سے آپ کی مجلس کشتِ زعفران رہتی۔ اعلیٰ علمی ذوق، تحقیقی مزاج، گفتگو میں علم کی گہرائی، دلوں کو موہ لینے والی سادگی کا نمونہ تھے۔ طرزِ زندگی اور مزاج میں انکساری اور عاجزی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ آپ علماء کی دینی وسیاسی تحریکوں خصوصاً تحریک آزادی کشمیر اور علماء کی تاریخ اور خدمات کے حوالے سے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپؒ کے علمائے کشمیر کے تعارف پر خصوصی نمبرز اور اور اہم شخصیات کے انٹرویوز وغیرہ ریکارڈ کا حصہ بنے، تاریخ دار العلوم دیوبند میں علمائے کشمیر کا تعارف اور خدمات شامل کروانا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ آپؒ کا کتب خانہ علمی وتحقیقی کتب واخبارات وجرائد کا ایک مخزن ہے، کراچی سے نعمان پورہ باغ تک نایاب کتابوں کے سیکڑوں قلمی نسخوں اور کتب کے حواشی پر آپ کے تحقیقی نوٹس ثبت ہیں۔ فاضلِ دار العلوم دیوبند مولانا امیر الزمانؒ ان کے چچا وسسر تھے، ان کے بعد آپؒ قاسم العلوم نعمان پورہ باغ کے مہتمم بنے۔ تقریر وتحریر اور تدریس، ہر فن میں خصوصی ملکہ اور صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کی کاوشوں سے بہت سا علمی ذخیرہ وجود میں آیا اور محفوظ ہوا۔ مولانا طیب کشمیریؒ بہت سے اوصاف واخلاق میں

اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور منفرد تھے۔

حضرت مولانا موصوف صاحبِ مطالعہ آدمی تھے۔ ماہنامہ بینات کے آپ ابتداء ہی سے قاری تھے، جب بھی کوئی مضمون یا اداریہ آپ کو پسند آتا تو آپ فون فرما کر حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم تصنیف فرمائی تو اس کے مواد وغیرہ جمع کرنے کی ذمہ داری میری لگائی گئی تھی، اور آپ نے مسلسل اس کو وقت دے کر بہت ہی مختصر وقت میں کتاب تیار کرلی۔ اس کے علاوہ بہت سے علمی وتحقیقی وتاریخی مقالات قلم بند کیے، خاص طور پر تحریک ختم نبوت کشمیر پر ان کا تفصیلی مقالہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقالات یکجا شائع ہوجائیں تو خاصے کی شے ہوگی۔

آپ کی زندگی مجاہدانہ گزری ہے، آپ نے اپنی زندگی میں کئی حوادثات کا سامنا کیا، لیکن ہمیشہ صابر اور قانع رہے۔ دو جوان بیٹے اور اہلیہ آپؒ کی زندگی میں فوت ہوئے، جن کا صدمہ آپ کو بہت ہی مضمحل اور کمزور کر گیا، لیکن اس غم اور صدمہ کو آپ نے پہاڑ کی طرح برداشت کیا، کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۱۱ر ذوالحجہ ۱۴۴۸ھ مطابق ۲۸ر مئی ۲۰۲۶ء بروز جمعرات جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ آپ کا جنازہ سبیل والی مسجد میں ہوا اور پھر کشمیر لے جایا گیا، جہاں ان کے آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں لائی گئی۔

آپ کے پسماندگان میں چار بیٹے، بھائی اور بھتیجے موجود ہیں۔ اللہ رب العزت موصوف کی کامل مغفرت فرمائے، آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور آپ کے لواحقین، شاگردوں اور تمام متعلقین، اعزہ واقرباء کو صبر جمیل نصیب فرمائے، آمین!

قارئینِ بینات سے حضرتؒ کے لیے ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

## دار الإفتاء

# اپنا مکان خود پر، بیوی پر، پھر فقراء پر وقف کرنا

ادارہ

### سوال

میں اپنا ایک مکان اس طریقے سے وقف کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک میں حیات ہوں، میں استعمال کرتا رہوں اور اگر میں پہلے فوت ہوجاؤں اور میری بیوی میرے بعد زندہ رہے تو جب تک وہ زندہ رہے وہ استعمال کرتی رہے، یعنی یہ مکان میراث میں تقسیم نہ ہو اور اس طریقے سے میرے اور میری بیوی کے استعمال میں رہے اور ہم میں سے جو بھی بعد میں فوت ہو، اس کے بعد وہ مکان ہمارے صدقہ جاریہ کے طور پر مسجد یا مدرسہ کے لیے وقف ہوجائے۔

❶ - شرعاً ایسا کرنا ممکن ہے یا نہیں؟

❷ - اگر ممکن ہے تو اس کے لیے کن الفاظ سے یہ وقف کرنا ہوگا؟

❸ - اس وقف کے بعد اگر کبھی دوبارہ اس وقف سے رجوع کرنا پڑے تو کیا ایسا ممکن ہوگا یا نہیں؟

❹ - زبان سے وقف کرنے کے لیے کیا شرائط ہیں؟ کہ شرعاً اور قانوناً یہ مکان میراث میں تقسیم نہ ہوسکے۔

❺ - وقف نامہ کی مکمل عبارت کیا ہو؟ متولی کا تذکرہ، موقوف علیہ مسجد یا مدرسہ کا تذکرہ، وغیرہ۔

### جواب

❶، ❷ - صورتِ مسئولہ میں اگر سائل اپنے مکان کو سوال میں لکھی ہوئی ترتیب کے مطابق وقف کرنا چاہتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ سائل یہ الفاظ وقف نامہ میں لکھے:

’’میں اپنا مکان اپنے اوپر اور اپنی بیوی کے اوپر وقف کرتا ہوں، اس کے بعد فلاں مسجد یا مدرسہ کے لیے۔‘‘

❸- جو چیز ایک مرتبہ وقف کردی جائے وہ واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور مخلوق میں کوئی شخص اس کا مالک نہیں رہتا، بلکہ وہ رب تعالیٰ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے، اس لیے اس میں رجوع کی گنجائش نہیں ہوتی اور واقف کا اس چیز کو دوبارہ لینا بھی درست نہیں ہوتا۔

❹- وقف کی شرائط یہ ہیں:

- وقف کرنے والا عاقل بالغ اور آزاد ہو۔
- جس جہت کے لیے وقف کیا جارہا ہو وہاں وقف کرنا باعثِ ثواب ہو۔
- جس جگہ کو وقف کررہا ہو وہ ذاتی ملکیت ہو۔
- وقف کرنے والا کم عقلی یا مقروض ہونے کی بنا پر تصرفات سے روکا نہ گیا ہو۔
- مجہول چیز وقف نہ کررہا ہو۔
- کسی شرط پر معلق کیے بغیر فی الفور وقف کرے۔
- وقف کو فروخت کرکے اس کی رقم اپنی ضرورت میں استعمال کرنے کی شرط نہ لگائے۔
- وقف کرنے والا اپنے پاس خیارِ شرط نہ رکھے۔
- وقف ہمیشہ کے لیے ہو۔
- وقف کی اجرت ایسی جہت کے لیے ہو جو نہ ختم ہونے والی ہو۔

❺- جزء نمبر 2 کے ذیل میں وقف نامہ کے لیے عبارت لکھ دی گئی ہے، اس کو دیکھ کر وقف نامہ تیار کرلیا جائے، پھر اگر آپ خود متولی رہنا چاہتے ہوں تو یہ بھی درست ہے اور اگر کسی دوسرے شخص کو متولی بنانا چاہتے ہوں تو اس کی صراحت کرلی جائے، نیز جس مسجد یا مدرسہ کے لیے وقف کرنا ہو اس کا بھی ذکر کردیا جائے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

’’ولو قال: وقفت على نفسي، ثم من بعدي على فلان، ثم على الفقراء جاز عند أبي يوسف - رحمه الله تعالىٰ - كذا في الحاوي.‘‘

(كتاب الوقف، الباب الثالث ، الفصل الثاني، جلد : ٢، صفحة: ٣٧١، طبع: دار الفكر)

فتاویٰ شامی میں ہے:

’’فإذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن.‘‘

(كتاب الوقف ، جلد : ٤ ، صفحة : ٣٥١ ، طبع : سعيد)

فقط واللہ اعلم

فتویٰ نمبر: 144511101603 — دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

# نقدونظر



ادارہ

## الحصن الأعظم اردو شرح الحزب الأعظم

تالیف: نور الدین ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ۔ ترجمہ: مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ۔ تخریج وتحقیق مع فضائل: ڈاکٹر مولانا ظفر نیاز صاحب۔ صفحات: ۴۹۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارہ المصباح، اردو بازار، لاہور۔ رابطہ نمبر: 0300-9483488

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ دسویں اور گیارہویں صدی کے مشہور عالم گزرے ہیں، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مکہ مکرمہ میں بسر ہوا ہے، مختلف علوم وفنون کے ماہر اور متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''الحزب الأعظم'' کو بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، اس کتاب میں ادعیۂ ماثورہ کا قیمتی ذخیرہ یکجا کیا گیا ہے، اس بنا پر زمانۂ تالیف سے یہ کتاب عوام وخواص کے معمولات کا حصہ رہی ہے۔ کتاب کو ہفتہ کے دنوں کی مناسبت سے سات منزلوں پر تقسیم کیا گیا ہے، اس ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ روزانہ ایک منزل پڑھنے سے کتاب میں مذکور تمام دعائیں ایک ہفتہ میں مکمل پڑھی جاسکتی ہیں۔ پہلی منزل قرآن مجید کی دعاؤں، اسمائے حسنیٰ، اور دعا کی قبولیت وغیرہ کلمات پر مشتمل ہے۔ دوسری سے چھٹی منزل میں احادیث میں ذکر کردہ مسنون دعائیں شامل کی گئی ہیں اور ساتویں منزل میں صلاۃ وسلام اور درود شریف کے اذکار واَوراد ہیں۔

اس کتاب پر عربی زبان میں مختلف جہتوں سے کام ہوچکے ہیں۔ اردو زبان میں بھی ''الحزب الأعظم'' کے مختلف ترجمے شائع ہوئے ہیں، ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کا ترجمہ سلاست وروانی اور عام فہم ہونے کی بنا پر مقبول ہے۔

پیشِ نظر کتاب ''الحصن الأعظم'' میں کتاب کی دعاؤں کی تخریج اور حسبِ ضرورت تشریح کی گئی ہے، دعاؤں کے فضائل وعنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے اور اعراب کی درستی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جناب ڈاکٹر مولانا ظفر نیاز صاحب (اسسٹنٹ پروفیسر میو ہسپتال، لاہور) نے معتمد اہلِ علم کی نگرانی اور مشاورت کے ساتھ یہ کام کیا ہے، متعدد علماء کی تقریظیں بھی کتاب کی ابتدا میں درج ہیں۔ کتاب دو رنگہ طباعت اور عمدہ کاغذ وسیٹنگ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس تحقیق اور عمدہ طباعت کی قدر دانی کریں گے۔